گر آئینہ دیکھا ہوتا

کنیز نبوی

کنیز نبوی

گر آئینہ دیکھا ہوتا

حویلی شاہ عبدالغنی نے لمبے برآمدے میں تخت پر بیٹھی ہوئی بی بی مریم نے یاسین شریف مکمل کر کے پانی پر دم کیا اور گلاس بھابی شیدن "جشن" کو تھما کر کہا۔

"یہ کنوار (دلہن) کو پلا دو۔"

بسم اللہ کہتے ہوئے بھابی شیدن نے گلاس تھاما اور کمرے کے دروازے پر دستک دے کر دائی کو گلاس تھما کر جیجی کنوار کو پلانے کی تاکید کی۔ واپس آ کر بی بی مریم کے پیر دبانے لگی۔

"جیجی اماں! تسلی رکھیں' اللہ نے چاہا تو اس دفعہ بھی بابا سائیں کا وارث ہی آئے گا۔" اب کے امیراں ملاح نے تسلی دی۔

جیجی اماں نے متبسم ہو کر آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور اضطراری انداز میں سبز مخمل کے گاؤ تکیے کے نیچے سے تسبیح نکالی۔ بھابی کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر کے پاؤں تخت پوش پر سمیٹ کر چار زانو بیٹھ گئیں۔ فکرو پریشانی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔

الحاج عطار رسول شاہ کے گھر یہ دوسری امید تھی' وہ بھی پانچ سال کے بعد۔ بی بی مریم کو اب کی بار بھی پوتے کی ہی خواہش تھی۔ اس نے بیٹی نہ ہونے کی کتنی ہی دعائیں مانگی تھیں مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

انہوں نے تسبیح ختم کر کے پھر دوسری پڑھنی شروع کی تھی' دائی اندر سے نمودار ہوئی۔

ناولٹ

"جیجی اماں! مبارک ہو۔" دائی نے آہستہ آواز میں کہا۔

انہوں نے تسبیح پڑھتے ہوئے دائی کو دیکھا اور ان کا ہاتھ تسبیح کے دانے پر ٹھہر سا گیا۔ دائی کے سنجیدہ چہرے نے انہیں باور کرا دیا کہ ان کی دعائیں قبول نہیں ہوئیں۔

"بابا سائیں کے گھر بچی ہوئی ہے۔" دائی نے استفہامیہ نظروں کے جواب میں کہا۔ بی بی مریم کے چہرے پر تاریک سایہ لہرا گیا۔

"جیجی اماں! مبارک ہو۔ ہاں ہاں جیجی! اللہ نے رحمت بنا کر بھیجا ہے چھوٹی بی بی کو۔ ویسے بھی اس حویلی کو ایک بچی کی ضرورت تھی۔" بھاپی شیدن نے اپنے مخصوص حبشی لہجے میں ہاتھ لہرا کر کہا۔

"ہاں، خیر مبارک۔" بی بی مریم نے ایک گہری سانس لے کر جواب دیا۔ "امیراں! تم بھی اب گھر جاؤ، تھک گئی ہو گی، آخر کو امید سے ہو۔" انہوں نے پژمردہ آواز میں امیراں کو ہدایت کی اور خود وہیں تخت پر لیٹ گئیں۔ بھاپی شیدن پھر سے ان کی ٹانگیں دبانے لگی اور وہ یادوں کی لہروں میں بہنے لگیں۔

"آہ۔ میری فردوس!" بچی کا نام سانس بن کے روح کی گہرائیوں سے نکلا، لبوں میں پھنس کے رہ گیا۔

شاہ عبدالعلی کتنا خوش ہوا تھا اس کی پیدائش پر اور ان کی ساس رنجیدہ اور اب وہ خود ساس بن کر پوتی کی پیدائش پر رنجیدہ ہو گئی تھیں۔ اس وقت تو ساس کے رنج پہ غصہ آیا تھا مگر گزرتے وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا رنج صحیح تھا۔ وہ بھی تو پوتی کے مقدر سے ڈرتی تھیں اور اب میں بھی پوتی کی قسمت سے خوف زدہ ہوں، کتنی دعائیں مانگی اللہ سائیں سے کہ اس گھر میں بچی نہ دے، اس گھر کی بچی کے نصیب اچھے نہیں ہوتے۔ مالک اب دی ہے تو اس کے نصیب اچھے دے۔" اس دعا پہ آنسوؤں نے ان کی پلکوں پر آکر آمین کہا تھا۔

تب ہی فجر کی اذان ہوئی اور وہ نماز کے لیے اٹھ گئیں۔ بھاپی نے ان کی پلکوں پر آنسوؤں کو پر تاسف نظروں سے دیکھا اور ان کے لیے جائے نماز بچھانے چل دی۔

وہ نماز پڑھ کر ابھی بیٹھی ہی تھیں، تب عطار سول شاہ مسجد سے سیدھا ان کے پاس چلا آیا۔

"مبارک ہو بیٹا! اللہ نے تمہیں بچی دی ہے۔" انہوں نے بیٹے کی پیشانی چوم کر کہا۔

"اماں جیجی! آپ میرے ساتھ چلیں۔ میری بچی کو مجھ سے پہلے آپ دیکھیں گی۔"

"نہیں بیٹا! تم جا کر اس کا نام رکھو، میں اشراق پڑھ کر آتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں تب تک انتظار کر لیتا ہوں۔" عطا رسول شاہ نے گہری نگاہ ان کے چہرے پر ڈالی۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں بیٹا! میری نحوست اس پر پڑ جائے۔ یہ میں نہیں چاہتی۔"

"اماں جیجی! ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ سب وہم ہے آپ کا۔"

"وہم... کیسا وہم عطار سول شاہ! یہ تو حقیقت ہے، کیا تمہیں پتہ نہیں جب تمہاری اچھی بھلی پھوپھی کو اچانک پاگل پن کے دورے پڑنے لگے تھے اور تمہاری بہن دس سال سے ہم سے بچھڑی ہوئی ہے، ان دونوں کو دادیوں نے ہی دیکھ کر پہلے گود میں اٹھایا تھا۔ اب میں چاہتی ہوں کہ پہلے تو اسے گود میں اٹھائے۔"

"میں اسی وہم ہی کو تو ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

"بیٹا! یہ باتیں ہمارے خاندان میں جڑ پکڑ چکی ہیں۔"

"اور میں اس جڑ ہی کو اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہوں۔ دیکھیے اماں جیجی! جب آپ اس وہم پر اتنا پختہ یقین کریں گی تو یہ واقعی یقین میں بدل جائے گا۔ بات صرف یقین کی ہوتی ہے، وہم و شک کی کوئی حیثیت نہیں۔ جو کچھ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے، وہ پورا ہو کے رہے گا۔ پھوپھو اور دادی کی قسمت میں یہی تھا۔ اس میں کسی کا دوش نہیں۔" عطا رسول شاہ نے مدلل انداز میں انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

"جب میں نے کہہ دیا کہ میں تمہاری بچی کو تمہارے نام رکھنے سے پہلے نہیں دیکھوں گی تو پھر تم اتنی ضد کیوں کر رہے ہو؟" بی بی مریم نے اب کی بار خاصے ناراض لہجے میں کہا۔

"تو ٹھیک ہے اماں جیجی! میں بھی آپ ہی کا بیٹا ہوں۔ جب تک آپ اسے گود میں نہیں اٹھائیں گی، تب تک نہ میں اس کا نام رکھوں گا اور نہ ہی دیکھوں گا۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

پھر وہ بیٹے کی ضد کے آگے ہار گئیں۔

ان کے خاندان کے لیے یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ پوتی کا نام رکھنے سے پہلے اگر اس کی دادی گود میں اٹھائیں تو اس کے نصیب اچھے نہیں ہوتے اور مثال ان کی نند اور بیٹی کی دی جاتی۔ سید عطار سول شاہ اسی وہم کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

✡ ✡ ✡

نور العین جس کی پیدائش پر رنج و غم نے اس کا استقبال کیا تھا، وہ اب بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ سب کی زندگی بنتی جا رہی تھی۔ اس کی توتلی باتیں سب کو متوجہ کرتیں۔ باپ کو دیکھ کر جوش و خروش سے اس کی طرف بڑھنا پھر بیچ میں ہی گر جانا، دادی کے ہاتھ سے اکثر تسبیح چھیننے کی کوشش کرنا، کبھی ان کے چشمے پر اچانک جھپٹنا، شاہ مراد کو دیکھ کر پاپا کہہ کر مچل جانا پھر ان کی گود میں بیٹھ کر تالیاں بجانا۔ اس کی ہر ہر ادا پر وہ سب نثار ہو جاتے۔ وہ مسکراتی تو سب کھل اٹھتے۔ وہ روتی تو سارا گھر پریشان ہو جاتا۔ وہ سب کی توجہ کا مرکز بنی رہتی۔

"اماں! نور جب کھلکھلاتی ہے تو میرا دل ہمک ہمک کر کسی شرارتی بچے کی طرح ناچنے لگتا ہے۔ اس کی مسکراہٹ میرے چار سو خوشیاں بکھیر دیتی ہے۔" عطا رسول شاہ نے خوشی سے معمور لہجے میں اپنی کیفیت ماں سے بیان کی۔

بی بی مریم نے متبسم ہو کر نگاہ پر شفقت اپنے ساتھ تخت پر بیٹھے بیٹے پر ڈالی اور اقرار میں گردن ہلا دی۔

"بچی ہمیشہ سے باپ کی خصوصی توجہ کا مرکز ہوتی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"بیٹا بھی تو پیارا ہوتا ہے مگر نور کے لیے میرے احساسات بڑے عجیب ہو جاتے ہیں۔" اس بات پر انہوں نے بھرپور انداز میں مسکرا کر عالم و فاضل بیٹے کو دیکھا۔

"اماں جیجی! بچی آخر اتنی پیاری کیوں ہوتی ہے؟" وقت کے جید عالم کے لہجے میں بڑی معصومیت تھی۔

"پرایا دھن ہوتی ہے نا اس لیے، پرایا دھن تو پرایا دھن ہوتا ہے۔ کتنی ہی حفاظت و محبت سے رکھو۔ دینا ہی پڑتا ہے۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر پھر گویا ہوئیں۔

"بچی کی مثال بھی چاند جیسی ہوتی ہے۔ کتنا ہی روشن لگتا ہی منور مگر بے داغ نہیں۔ کتنی ہی محبت سے کیوں نہ پالو پوسو مگر جدائی کا داغ تو لگ ہی جاتا ہے اور جب پرائی ہوتی ہے تو سارے رشتے ناتے بیکار ہو جاتے ہیں پھر وہ کسی اور کی ملکیت بن جاتی ہے۔ اس کی اپنی زندگی تو کہیں گم ہو جاتی ہے۔"

"ہاں، اسی لیے تو کہتے ہیں بیٹیاں چھوٹی ہوں تو مصری کی ڈلیاں، بڑی ہوں تو زہر کی پڑیاں۔ ڈر لگتا ہے ان کے مقدر سے کہ اماوس جیسا سیاہ نہ ہو۔ روشن مقدر والی بچی ہو تو والدین بھی جی اٹھتے ہیں، ورنہ تو لمحہ لمحہ دکھ سے مرتے رہتے ہیں۔" وہ بولتے بولتے آبدیدہ ہو گئیں۔ عطار سول شاہ کو یہ احساس بڑی شدت سے ہوا کہ نادانستگی میں ہی سہی اس نے ماں کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا ہے۔

✡ ✡ ✡

ہر طرف گہما گہمی شور و غل مچا ہوا تھا۔ ساری حویلی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ نیچے بچھی ہوئی چٹائیوں پر عورتیں بیٹھی تھیں۔ ان میں کچھ گاؤں کی، کچھ ارد گرد کے گاؤں کی اور کچھ قریبی معتقدین تھیں، جنہیں خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا کیونکہ آج نور العین کی رسم بسم اللہ تھی۔

بی بی مریم یہ گہما گہمی بڑی خوش کن نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ تخت کو برآمدے سے نکال کر صحن میں رکھ کر سجایا گیا تھا۔ چاروں جانب لوگ تھے، خوشیاں تھیں، روشنیاں تھیں۔

"بابا سائیں! چھوٹی بی بی کو لے کر آ رہے ہیں۔" سرگوشیوں میں ایک دوسرے کو اطلاع دی گئی۔ بیک وقت کئی نظریں اٹھی تھیں جن میں تحیر بھی تھا خوشی اور عقیدت بھی۔

"بابا سائیں خود اٹھا کر لا رہے ہیں، بڑا پیار کرتے ہیں بچی سے۔" پر مسرت انداز میں تبادلۂ خیال ہو رہا تھا۔

عطار سول شاہ، پریوں جیسی نور العین کو گود میں لیے آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے شاہ مراد، ماں کے ساتھ آ رہا تھا۔ وہ سیدھا ماں کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ نور کو بیچ میں بٹھا کر سپارہ دیا گیا۔ بی بی مریم نے سرک کر پوتے اور بہو کے لیے جگہ بنائی۔

"اماں! آپ شروع کریں۔"

"نہیں بیٹا! اللہ نے تجھے علم سے نوازا ہے۔ پہلا سبق تو ہی دے۔" پانچ سالہ نور کو پہلا سبق باپ نے دیا۔ جوں ہی اس نے بسم اللہ پڑھ کر الف پڑھا، مبارک مبارک کا شور بلند ہوا۔ آگے کیا پڑھا کسی نے نہیں سنا۔ عورتیں اٹھ اٹھ کر بی بی مریم کے گلے لگ کر اور ہاتھ چوم کر ان کو مبارکباد

دے رہی تھیں۔ ان سب پر پھول نچھاور کیے جا رہے تھے' ہار پہنائے جا رہے تھے۔ عجیب مسرت و خوشی کا سماں بندھا ہوا تھا۔

ایسے میں وہ انھیں' اپنی بیٹی کی یاد آ رہی تھی۔ کتنا دل کرتا ہے ہر موقع پر کہ وہ بھی ساتھ ہو مگر وہ تو سگے بھائی کی شادی پر بھی نہیں تھی۔

وہ بار بار آبدیدہ ہو رہی تھیں' یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ بیٹے کی خوشی کو اداسی میں بدل دیں۔

"کنوار! تم جا کر انتظام دیکھو' ایسا نہ ہو کہ کوئی رہ جائے۔ مائیوں (کام والیوں) سے کہو سب کو دھیان سے کھانا کھلائیں۔" وہ توجہ ہٹانے کے لیے بہو کو ہدایت دینے لگیں۔

☼ ☼ ☼

بابا سائیں کی حویلی کا لنگر تیار کرنا' امیراں ملاح کے ذمے تھا۔ اس کی ایک بیٹی نوراں' جو نور العین کی ہی ہم عمر تھی۔ اس کے دل میں پہلی خواہش نوری بی بی کی رسم بسم اللہ کی رات جاگی تھی۔ جب اس نے امیراں سے ضد کی کہ مجھے بھی ایسا ہی تاج پہناؤ جیسا نوری بی بی نے پہنا ہوا ہے' اس کی ماں نے بجائے اسے بہلانے کے جھڑک دیا۔

"پاگل ہوئی ہے' وہ تو بابا سائیں کی بیٹی ہے اور تو غلامو مچھیرے کی۔ کیسے برابر ہو سکتی ہے؟" اس جھڑک نے اسے اور طیش دلایا تو وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

تنگ آ کر اس کی ماں نے اسے زمین پر پٹخ دیا اور خود کام میں لگ گئی۔ چند ایک عورتوں نے پوچھا تو بہانہ بنا کر ٹال دیا۔ وہ وہیں زمین پر روتے روتے سو گئی۔

صبح تک وہ یہ بات بھول چکی تھی' کچھ ہی دنوں بعد اس کی ماں اسے جیجی اماں کے پاس لے آئی کہ اسے بھی سپارہ پڑھائیں۔ جیجی اماں نے اسے مسکرا کر سپارہ تھمایا اور اپنے ساتھ تخت پر بٹھا کر سبق دیا اس وقت بھی اس کا کتنا دل چاہا کہ کوئی ایک ہار ہی اس کے گلے میں ڈال دے مگر یہ بات مارے ڈر کے وہ کہہ نہ سکی۔

اسے یاد تھی وہ ڈانٹ' جو اس کے باپ نے پلائی تھی' تاج والی ضد پر۔

وہ دیکھتی نوری بی بی کھانا نہیں کھاتی اور جیجی کنوار نوالہ ہاتھ میں لے کر اس کے پیچھے دوڑتی رہتی مگر نوری بی بی چند نوالوں کے بعد کھانے سے انکار کر دیتی' پھر جیجی کنوار کھلونوں کا لالچ دیتی' تب بھی وہ چند نوالے اور کھاتی۔

اس کا بھی دل چاہتا ایک بار ہی سہی' اماں بھی یوں میرے پیچھے نوالہ لیے دوڑتی رہے اور وہ نخرے کرے تو اسے بھی کھلونوں کا لالچ دے...... مگر اس کی ماں کو تو یاد ہی نہیں آتا کہ کھانے کا وقت گزر گیا ہے۔ جب بھوک زیادہ ستاتی تو وہ خود ہی جا کر کھانا مانگتی۔

امیراں اسے کھانا دے کر ڈانٹتی۔

"اتنی بڑی ہو گئی ہے مگر خود سے وقت پر کھانا نہیں کھاتی۔ اتنے کام ہیں میرے اوپر' اب یہ بھی میں یاد دلاؤں کہ نواب زادی! آؤ' کھانا کھاؤ۔"

اس کی خواہش لبوں پر ہی دم توڑ دیتی۔ اسے حیرت ہوتی کہ نوری بی بی کو آخر بھوک کیوں نہیں لگتی؟ تب وہ اس بات سے بے خبر تھی اور دوسری بہت سی چیزیں کھانے کے بعد بھوک کیسے لگ سکتی ہے؟ وہ تو صرف روٹی کھاتی تھی۔ روٹی' جو نہ ملے تو بندہ دین بھی بیچ دیتا ہے۔

☼ ☼ ☼

جوں ہی عطا رسول شاہ گھر میں داخل ہوئے' وہ دوڑ کر ان کے گلے لگ گئی۔ "بابا میری چیزیں۔" اور انہوں نے ڈھیر سارے کپڑے' کھلونے' چاکلیٹ' چپس کے پیکٹ اس کو تھمائے۔ ساری لسٹ اس نے بیٹھ کر بھائی سے لکھوائی تھی اور شاہ مراد اس کی ہر فرمائش مسکرا کر لکھتا رہا۔ یہ ساری شاپنگ اس نے ہی کراچی سے کر کے باپ کے ہاتھوں بھجوائی تھی جو اسے کالج میں داخل کروانے کے لیے اس کے ساتھ گئے تھے۔

بی بی مریم نے پہلے پہل تو مخالفت کی کہ پوتا نظروں کے سامنے سے دور نہ ہو مگر بیٹے نے آخر انہیں قائل کر ہی لیا۔

"اماں! آج کل انگریزی کا دور ہے' اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ وہ یہ تعلیم بھی حاصل کرے۔"

"تو ہم نے کون سی اسے نوکری کروانی ہے' اسے سنبھالنی تو باپ دادا کی گدی ہی ہے۔ ویسے بھی کوئی ان پڑھ تو نہیں ہے۔ حدیث کا علم حاصل کیا ہے اس نے۔ علم فقہ اپنے مدرسے سے پڑھا ہے۔ یہ مدرسہ ہی تو اسے سنبھالنا ہے۔ کون سا انگریزی اسکول چلانا ہے۔" بیٹے کی بات پر انہیں غصہ آ گیا تھا۔ "لو دین کے علم کی تو کوئی قدر ہی نہیں جسے دیکھو انگریزی کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔"

"اماں! کیوں نہیں ہے دین کے علم کی قدر۔ ہزاروں بچے پڑھتے ہیں مدرسوں میں۔ ان کے والدین کو اس علم کی قدر ہے۔ تب ہی تو میلوں دور چھوڑ جاتے ہیں بچوں کو مگر اماں جیجی! دینی علم کے ساتھ دنیاوی علم بھی ضروری ہے۔ اسلام نے تو اس سے منع نہیں کیا۔ بھلا آپ خود ہی بتائیں کہ ابھی میں نے ہی اپنے مدرسے کے پڑھے ہوئے چند لڑکوں کو ڈھونڈ کر دور دراز کی مسجدوں میں پیش امامی دلوائی ہے' وہ بھی صرف ڈیڑھ دو ہزار پر۔ مدرسوں سے پڑھ کر نوجوان جب نکلتے ہیں تو ان کو کوئی مسجد ہی نہیں ملتی' نہ ہی نوکری۔ اب وہ کدھر جائیں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ شاہ مراد دنیاوی تعلیم حاصل کرے تو پھر ہم اپنے مدرسے میں دینی تعلیم کے ساتھ یہ نظام بھی متعارف کروائیں تاکہ جب کوئی شاگرد پڑھ کر یہاں سے نکلے تو اسے کہیں نہ کہیں روزگار ضرور مل جائے۔ آخر کو مدرسہ شاہ مراد نے ہی سنبھالنا ہے۔" انہوں نے بڑی رسانیت سے ساری بات ماں کو سمجھائی۔

"پر بابا عطا رسول شاہ! مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ کراچی بڑا ہی بے وفا' بے نیاز شہر ہے۔ جو بھی جاتا ہے' گم ہو جاتا ہے۔ اپنا آپ بھی کھو بیٹھتا ہے انسانوں کے جنگل میں۔ میری فردوس بھی تو کھو گئی ہے۔"

"بھلا شہر بھی بے نیاز و بے وفا ہوتے ہیں۔ اماں جیجی! یہ تو لوگ ہی انہیں ایسا بناتے ہیں۔" انہوں نے ماں کو رسانیت سے سمجھایا۔

"بس اماں جیجی! آپ فکر نہ کریں' میں جا رہا ہوں نا اب' پھپھو کو تلاش کر لوں گا۔" پوتے کے دلاسے پر وہ مسکرا دی تھیں۔

"اماں جیجی! بابا سائیں' اماں مجھے ڈانٹتی ہیں۔" نور نے روتے ہوئے شکایت لگائی تھی۔ ان دونوں نے اس کے پیچھے آتی بی بی کنوار کو استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"اماں! یہ بہت بدتمیز ہو گئی ہے۔ بار بار نوراں کو مچھیرن' ملاح زادی' پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہی ہے۔ میں نے منع کیا تو روتے روتے آپ کے پاس آ گئی۔" اس نے وضاحت دی۔

"تم بھی انصاف کرو کنوار! بھلا بچی نے کہہ دیا تو کیا ہو گیا؟ آخر وہ غلامو مچھیرے کی بیٹی نہیں ہے تو کس کی ہے۔ ایسا بھی کیا کہہ دیا تھا بچی نے کہ تم نے اسے ڈانٹ دیا۔" انہوں نے جزبز ہو کر شوہر کی طرف دیکھا مگر وہ نور کو گود میں بٹھائے اسے منانے میں مگن تھے۔

"جیجی پھپھو! ہمارے پاس تو ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ یہ ہمارے خاندان کی شان تو نہیں ہے کہ وہ یوں باتیں اٹھا اٹھا کے سب کے منہ پر مارتی رہے۔" اس نے دبی دبی آواز میں احتجاج کیا۔

"حد کرتی ہو تم بھی کنوار! بچی کو بچی ہی رہنے دو' بڑی ہو گی تو سب سمجھ جائے گی۔ تم تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے ہی پڑ گئی ہو۔" بی بی مریم نے ہلکے اشتعال سے کہا۔

"ہاں میں تو اس کی جیسے دشمن ہوں۔" وہ کہتے کہتے رک گئی اور امداد طلب نظروں سے شوہر کو دیکھا جو ہنوز خاموش بیٹھے تھے۔

☼ ☼ ☼

سید عبدالعلی شاہ' شاہ گوٹھ کے وڈیرے بھی تھے۔ باریش' درمیانے قد' بھرے بھرے جسم کے حامل۔ ہمیشہ ان کے چہرے پر شفقت و رحم دلی کے آثار نمایاں ہوتے۔ کوئی سوالی آتا تو ان کو خالی لوٹانا ان کی سرشت میں نہیں

تھا۔ گاؤں والے ان کی رحم دلی کے گن گاتے۔ شادی کی تاریخ مقرر کرنی ہو' نکاح پڑھوانا ہو یا کسی نومولود کا نام تجویز کرنا ہو' سارے گاؤں کے لوگ دوڑ کر ان کے پاس آتے اور پھر جو شاہ صاحب کہہ دیں' وہ پتھر پر لکیر۔ وقت پڑنے پر ہر ایک کے کام آتے۔

ان ہی خوبیوں کی بنا پر لوگ انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے' ان کا ہر حکم مانتے' ان کے ہر ایک کے ساتھ اچھے سلوک نے سارے گاؤں میں امن و محبت کی فضا برقرار رکھی ہوئی تھی مگر جب کسی بستی سے بزرگ ہستی کا سایہ اٹھ جائے تو طرح طرح کی آفتیں اس بستی پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ شاہ گوٹھ پر بھی اچانک آفت نازل ہوئی تھی۔

جب عبدالعلی شاہ دوسرے شہر ایک مذہبی جلسے میں تقریر کرنے گئے تھے اور واپس لوگوں کے کاندھے پر آئے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح گاؤں میں پھیلی تھی۔ لوگ روتے چیختے حویلی کی جانب بڑھے' لاش باہر والے بنگلے میں رکھی تھی اور اندر حویلی میں ماتم برپا تھا۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی تھی۔

سترہ سالہ بی بی فردوس ماں کو دلاسہ دیتے دیتے خود تڑپ تڑپ کر روپڑتی تو سب کے کلیجے منہ کو آجاتے۔

عطار رسول شاہ کو یتیمی کا تو کچھ خاص احساس نہیں تھا مگر ماں بہن کو روتے دیکھ کر خود بھی رونے لگتا۔

شاہ عبدالعلی کا چھوٹا بھائی غلام نبی شاہ بنگلے میں آنے والے لوگوں سے تعزیت لے رہا تھا۔ وقتی طور پر سارا کاروبار اس کے ہاتھ میں آگیا۔ درگاہ سنبھالنا' عقیدت مندوں سے ملنا' زمینوں کو دیکھنا' لوگوں کے فیصلے کرنا' سب کام غلام نبی شاہ کی مرضی کے مطابق ہو رہے تھے۔

حرص و ہوس جو ازل سے انسان کو شکار کرتے آئے ہیں' اب اسی حرص و ہوس کا نشانہ غلام نبی شاہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا تم نے خود سنا؟" بی بی مریم نے پھاپی شیدن کو جانچتی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں بیجی! قسم لے لیں' میں نے اپنے ان گناہ گار کانوں سے سنا ہے۔ سائیں غلام نبی شاہ' چھوٹے سائیں سے کہہ رہے تھے کہ عطار رسول شاہ ابھی چھوٹا ہے۔ کچھ بھی سنبھالنے کے قابل نہیں ہے' اس لیے پگ میں باندھوں گا۔"

"تو پھر کیا کہا عبداللہ شاہ نے؟" اس نے سوئی ہوئی فردوس پر ایک نظر ڈال کر پھاپی سے پوچھا۔

"بیجی! یہ تو مجھے پتہ نہیں کہ انہوں نے کیا کہا۔ چھوٹے سائیں کی آواز بہت دھیمی تھی مگر سائیں غلام نبی' چھوٹے سائیں کو جلد کارڈ چھپوانے کا کہہ رہے تھے' جن کو دعوت نامے بھیجے جائیں گے' ان کی لسٹیں بنانے کو بھی کہہ رہے تھے۔" پھاپی شیدن نے سرگوشیوں میں ساری بات بتائی۔

"یہ انصاف نہیں کر رہے' ادا غلام نبی شاہ! پگ باندھنا' سجادہ نشین بننا صرف عطار رسول کا حق بنتا ہے۔ میں اپنے بچے کے ساتھ انہیں یہ ناانصافی نہیں کرنے دوں گی۔ مانا کہ عبداللہ شاہ' کل کو اسی گھر کا داماد بنے گا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنے بیٹے کے حق سے دست بردار ہوجاؤں۔" بی بی مریم نے دکھ سے کہا۔

ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی چند عورتوں نے تائیداً سر ہلائے۔

"آپ صحیح کہتی ہیں بیجی! گدی نشین عطار رسول شاہ کو ہی بننا چاہیے۔"

"پھاپی!"

"جی بیجی!"

"صبح غلام رسول شاہ کو ساری بات بتانا کہ وہ جاکر ادا غلام نبی سے بات کرے۔ دیکھتے ہیں کیا جواب دیتے ہیں۔" بی بی مریم نے پھاپی کو تاکید کی اور سونے کے لیے لیٹ گئیں مگر نیند ان سے روٹھی رہی۔ پھاپی ان کے پاؤں دباتی رہی اور بی بی مریم کا تکیہ بھیگتا رہا۔

عدت میں اب چند روز رہ گئے تھے۔ رواج کے مطابق عدت ختم ہونے پر ہی پگاڑا پگ باندھتا تھا۔ ولی عہد گدی کا سجادہ نشین بنتا۔ اپنے خاندان کے بزرگ اور دوسرے خاندانوں کے سجادہ نشین ایک ایک ور "بل" دیتے جاتے۔

مگر غلام نبی' عطار رسول کی کم سنی کے بہانے خود پگاڑا بننا چاہتا تھا۔ دوسرے معنی میں عطار رسول سے ہمیشہ کے لیے یہ حق چھین لیا جاتا۔ اس کی جائیداد پر بھی قبضہ کرلیا جاتا۔ وہم' وسوسے انہیں پریشان کر رہے تھے' انہیں بیٹے کا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔ ان کی بے آواز سسکیوں پر پھاپی کے ہاتھ جلدی جلدی پاؤں دبانے لگے۔ اس کے آنسو بی بی مریم کے پاؤں پر گر کر وفا کا عہد کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

دیکھ ادا غلام نبی! تمہارے پگ باندھنے کا فیصلہ غلط ہے۔ یہ ہماری ریتوں رسموں کے خلاف ہے۔ ہمارے ہاں پگ پگاڑے کا بڑا بیٹا باندھتا ہے۔ سندھ کے رواج کے مطابق پگ دار کے بیٹے کی موجودگی میں بھائی پگ نہیں باندھ سکتا۔" غلام رسول نے ٹھنڈے لہجے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ غلام نبی' تھوڑی دیر انہیں دیکھتا رہا پھر اس سے بھی زیادہ ٹھنڈے مزاج سے کہا۔

"دیکھ ادا غلام رسول! عطار رسول ابھی بہت چھوٹا ہے۔ نہ درگاہ سنبھال سکتا ہے اور نہ مرید اور لنگر کا انتظام دیکھ سکتا ہے۔ جب وہ اس قابل ہوجائے گا تو میں سب کچھ اس کے حوالے کردوں گا۔ ابھی وہ چھوٹا ہے' تب ہی میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ اب مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ آپ کو خوامخواہ کیوں اعتراض ہو رہا ہے؟" غلام نبی کا لہجہ آخر میں عجیب ہوگیا۔

غلام رسول نے اپنے آپ کو نشانہ بنتے دیکھا تو رسانیت سے بات سنبھالی۔

"ادا! ذاتی طور پر مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر آپ کے ایسا کرنے سے خاندان بھر میں نئے تنازعے کھڑے ہوجائیں گے۔ کل کلاں کوئی چھوٹا بھائی طاقتور ہوگیا تو بڑے بھائی کی پگ کو نہیں مانے گا۔ اپنے زور پر خود پگ دار بن جائے گا اور خاندان والے' مرید اور دوست بھی آپ کا یہ فیصلہ نہیں مانیں گے' ورنہ میرے دل میں تو کوئی بات نہیں ہے۔ آپ عطار رسول کے چاچا ہیں' شرعی وارث ہیں' جو مناسب سمجھیں وہ کریں۔ مجھے تو ادی مریم کا پیغام ملا۔ سو میں آپ سے بات کرنے آگیا۔" غلام نبی ان کے مصالحانہ انداز پر نرم پڑگیا۔

"ٹھیک ہے ادا! بھاجائی مریم نے آپ کو بھیجا ہے تو پھر چل کر ان سے بھی بات کرلیتے ہیں۔" وہ دونوں اوطاق (مردان خانے) سے نکل کر حویلی میں آگئے۔

پھاپی شیدن نے جونہی دونوں کو حویلی میں آتے دیکھا تو سیدھی ان کے پاس آئی۔

"سلام سائیں!"

"ہاں پھاپی! ادی مریم کو کہو' ادا غلام نبی بات کرنے آیا ہے۔"

"پر سائیں! بیجی تو ابھی عدت میں ہے' پردہ کرتی ہے۔"

"تمہیں پتہ ہے چری (پاگل) ہم برآمدے میں بیٹھتے ہیں۔ ادی کمرے ہی میں بیٹھی رہے۔ اب خالی (خالی)

بات کرنے میں تو حرج نہیں ہے نا!"

"حاضر سائیں! میں ابھی اطلاع کرتی ہوں۔" پھاپی بات سمجھ کر اندر بڑھی تو وہ دونوں ہنسنے لگے۔

بی بی مریم نے ان دونوں کی بات سمجھنے سننے کے بعد ان سے کہا کہ زمینیں' درگاہ' لنگر مرید' سب کچھ ادا غلام نبی سنبھالے مگر پگ عطار رسول ہی باندھے گا۔ غلام نبی اس تجویز پر اچھا خاصا ناراض ہوا۔

"میں کوئی نوکر نہیں ہوں جو سب کچھ سنبھال کر بھی پگ نہ باندھوں گا۔"

"ادا! اگر آپ ہماری یہ بات نہیں مانتے تو برادری' سیدوں' عالموں کو بلا کر فیصلہ کروالیں پھر جو ان کا فیصلہ ہوگا' وہ ہمیں بھی قبول ہوگا۔" بی بی مریم نے حتمی انداز اختیار کیا۔ غلام رسول شاہ دونوں کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔

"ہاں بھاجائی! فیصلے کی پگ تو ہم نے آپ کو بندھائی ہے ناں۔ ہم چوڑیاں پہن کر بیٹھ جاتے ہیں اندر۔ آپ لوگوں نے خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنالیا ہے۔" غلام نبی آگ بگولہ ہوگیا۔ "ہاں ہاں میں سب سمجھتا ہوں کہ کس نے ورغلایا ہے آپ کو؟" اس نے غلام رسول کو تیز نظروں سے دیکھا۔ غلام رسول اپنی غیر جانبداری کے باوجود مجرم بن گیا تھا۔

بالآخر غلام نبی کو اپنی خواہش سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس کا سارا منصوبہ ناکام ہوگیا۔ اس کو بی بی مریم سے یہ توقع نہیں تھی۔ عطار رسول کی کم سنی کا بہانہ نہایت ہی موزوں تھا جو وہ برادری کے سامنے بیان کرتا مگر غلام رسول کی آمد نے ان کی حکمت عملی کو ناکام بنادیا تھا۔ اب وہ پگ باندھتا تو سب کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا مگر یہ بات اسے تشویش میں مبتلا کیے ہوئے تھی کہ بی بی مریم کو یہ خبر کیسے پہنچی؟

☼ ☼ ☼

عدت کے آخری دن لوگ جوق در جوق آنا شروع ہوچکے تھے۔ دوسری گدیوں کے معززین بھی آنا شروع ہوگئے تھے۔

جیسے جیسے وقت گزرتا رہا' بی بی مریم کا اضطراب بڑھتا گیا۔ آنے والی عورتوں سے بھی وہ صحیح طور سے بات نہیں کرپا رہی تھی۔ جب ظہر کی نماز پڑھ کر وہ تخت پر بیٹھی' اسی وقت پھاپی شیدن نے آکر ان کے کان میں مبارک دی۔

"جیجی! پگ عطار رسول شاہ کو باندھ دی گئی ہے اور اسے پہلا ور (دلہا) سائیں غلام نبی شاہ نے دیا ہے۔"

بی بی مریم کے اضطراب میں ایک دم سے کمی آئی تھی۔ ان کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ اس نے پھاپی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

کچھ ہی دیر بعد عطار رسول پگ باندھے غلام نبی شاہ کا ہاتھ تھامے حویلی میں داخل ہوا۔ عورتیں اس نو عمر سجادہ نشین کے ہاتھ چومنے لگیں مگر جب وہ ماں کے گلے لگ کر خود بھی رو پڑا تو سب ہی پہ ایک بار پھر رقت طاری ہو گئی تھی۔ وہ منظر ہی اداسی و سوگواری کا جب اچانک عطار رسول کو ادراک ہوا تھا کہ وہ یتیم ہو گیا ہے اور اس پٹکے (پگ) کے بلوں میں خاندانی عزت و ناموس ذمہ داری کو باندھ دیا گیا ہے۔ بہت بڑا بوجھ جواب اسے اٹھانا ہے۔

اس منظر کی رقت میں اس وقت اور اضافہ ہوا جب غلام نبی نے بی بی مریم کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بھاجائی! صبر کرو۔" تب بی بی مریم نے آنسوؤں کے بیچ سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا مگر وہ کسی بھی طرح کی رنجش، غصے نفرت کو ان کے چہرے پر نہ ڈھونڈ سکیں۔

"ادا! عطار رسول اتنا بھاری بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ ابھی چھوٹا ہے، اس لیے سارا انتظام آپ ہی کے سپرد ہے۔" بی بی مریم کے کہنے پر غلام نبی نے ہلکے سے اثبات میں سر کو جنبش دی اور واپس لوٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

"مگر ادا! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ باپ کی برسی نہیں گزری اور بیٹی کی شادی ہو جائے؟" غلام نبی نے اسے ربیع کی فصل کا حساب دے کر عبداللہ شاہ کی شادی کی بات چھیڑی تو بی بی مریم نے حیران ہو کر انکار کیا تھا۔

"دیکھو بھاجائی! شرع میں تو کسی بات کی منع نہیں ہے اور ویسے بھی ادا کو گزرے آٹھ ماہ تو ہو ہی گئے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ادا! مگر گاؤں والوں نے بھی اپنی بیٹیوں کی شادیاں روک دی ہیں برسی تک تو ایسے میں خود انہی کی بیٹی کی شادی زیب تو نہیں دیتی نا!!"

"مگر بھاجائی! لوگوں کو ہم نے تو منع نہیں کیا۔ انہوں نے خود سے یہ فیصلے کیے ہیں۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں، جب لوگوں کو اتنا خیال ہے پھر یہ ہمارے تو گھر کا واقعہ ہے۔" بی بی مریم ان کی بات بیچ میں کاٹ کر استعجابیہ لہجے میں بولی۔

"بھاجائی! یہ تقریب سادگی سے بھی تو ہو سکتی ہے، بغیر ڈھول باجے کے۔ نکاح تو پہلے ہو چکا ہے، صرف رخصتی ہی تو کرنا ہے، وہ سادگی سے کر دیں۔" غلام نبی دبے دبے غصے سے بولا۔

"ادا! لوگ ہنسی اڑائیں گے۔ آخر آپ کو اتنی جلدی کیا ہے۔ تین چار ماہ ٹھہر جائیں پھر جو آپ کہیں گے وہی ہو گا۔" بی بی مریم نے التجا کی۔

"بھاجائی! آپ تو صرف اپنی ہی کرتی ہیں، کبھی کبھی کسی کی بات مان بھی لینا چاہیے مگر کیا کیا جائے، یہ ہماری قسمت کہ ادا عبدالعلی کے بعد ہمیں عورتوں کے آگے سر جھکانا پڑا۔ وہ شکر کس کو دیں، اپنے نصیب کو یا موت کو جو مرد مار کر چلی گئی۔ صحیح کہتے ہیں۔ مرد (سردار) کے مرنے پر کوٹھ اجڑ جاتے ہیں۔" وہ غصے میں اٹھ کر چلا گیا اور بی بی مریم اس کے دھیمے لہجے میں چھپے طنز پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"جیجی! جیجی! حوصلہ کریں۔" پھاپی نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

"تم نے سنا پھاپی! ادا غلام نبی نے طنز کے تیروں سے میرا جگر چھلنی کر دیا۔ کیا کچھ نہیں سنا گیا مجھے۔

اب بتاؤ تم لوگ جس کے لیے لوگوں کے آنسو تک خشک نہیں ہوئے، اس کی بیٹی بیاہ دوں۔ ارے یہاں تو کوئی کمی مر جائے تو اس کی بھی برسی تک خوشیاں منسوخ ہو جاتی ہیں۔ یہ تو سید عبدالعلی شاہ تھے، شاہ کوٹھ کے سیدوں کا گدی نشین سردار، کیسے بیاہ دوں یکدم اس کی بیٹی۔ دنیا تھوکے گی نہیں ہم پر۔"

"جیجی! آپ نے صحیح کیا جو چھوٹے سائیں کو انکار کیا۔ بالکل صحیح فیصلہ ہے آپ کا۔" امیراں نے اس کی ہمت بندھائی۔

"یہ بیوگی کا بوجھ بہت بڑا عذاب ہے، بہت بڑا عذاب۔ کمر بھی جھکا دیتا ہے اور سر بھی۔ زبان کھولو تو بے حیائی۔ فیصلہ کرو تو سو مرنے کا طعنہ، کہیں آؤ جاؤ تو آوارہ کہلاؤ۔ آخر زندگی جائے تو کہاں جائے۔"

"ہاں جیجی! ایسا عمل تو کسی کے پاس نہیں ہے، جس سے سب راضی ہوں، خوش ہوں۔ بھلا چار سجن، چار دشمن تو سب ہی کے ہوتے ہیں نا! آپ دل پر نہ لیں یہ بات۔ اگر ایسی باتوں کو دیکھیں گی تو بی بی فردوس اور سائیں عطار رسول کی زندگی مشکل ہو جائے گی، ان کو کون حوصلہ دے گا آپ کے سوا؟" پھاپی کے سمجھانے پر بی بی مریم نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

☆ ☆ ☆

عبدالعلی شاہ کی برسی کو تین روز گزر گئے تھے۔ بی بی مریم مہمانوں کا ناشتہ تیار کروا رہی تھیں۔ انہوں نے غلام نبی کو آتے دیکھ کر پھاپی کو ہدایت دی کہ اوطاق میں ناشتہ دھیان سے بھجوائے اور خود صحن سے گزر کر برآمدے میں آئیں۔

"ادا! بھلی کرے آیا۔" انہوں نے غلام نبی کو خوش آمدید کہا اور وہیں بڑے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"بھلائی بھاجائی!" غلام نبی جواب دے کر تخت پر بیٹھ گیا۔

"بھاجائی! ادا کی برسی بھی گزر گئی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ عبداللہ شاہ کی شادی کی تاریخ رکھ دوں۔ آپ کیا کہتی ہیں؟" اس نے زمین کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ادا! آپ دھنی (مالک) ہیں جو آپ کی مرضی۔"

اس نے بھنویں اچکا کر بی بی مریم کو دیکھا۔ ہاں تو پھر شعبان کی انیسویں تاریخ کیسی رہے گی؟"

"ٹھیک ہے ادا! جیسے آپ کی مرضی۔"

بی بی مریم کے "جیسے آپ کی مرضی" کہنے پر وہ طنزیہ انداز میں مسکرا کر اٹھ گیا۔

اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ طنزیہ مسکراہٹ اور چہرے کے تاثرات بھی وہ کام کر جاتے ہیں جو کوئی طنزیہ جملہ بھی نہ کر سکے۔ وہ بھی غلام نبی کے چہرے کے تاثرات پڑھ کر رہ گئیں۔

"جیجی! چھوٹے سائیں کیا کہہ رہے تھے۔ کیا تاریخ لینے آئے تھے؟" پھاپی کے پوچھنے پر وہ اپنی سوچ سے چونک گئیں۔

"ہاں، ستائیس تاریخ اگلے ماہ کی۔" وہ آبدیدہ ہو گئیں۔

"ہاں جیجی! بیٹی کی روٹی تو بادشاہ کے گھر بھی نہیں۔"

پھاپی گہری سانس لے کر بولی۔

بی بی مریم کے آنسو بہہ نکلے۔

"یہ تو پیغمبر کی سنت ہے۔ پر پھاپی! بکری کا بچہ پالتے ہیں تو اس سے بھی انسیت ہو جاتی ہے۔ یہ تو بیٹی کا معاملہ ہے، اپنے جگر کا ٹکڑا، پالو پوسو، جوان کرو پھر کسی کو دے دو۔ اپنے تو سارے اختیار چھن جاتے ہیں۔ بس اللہ نمانیوں کے نصیب اچھے کرے، ورنہ مائٹوں (والدین) کے لیے تو درد ہی درد، غم ہی غم ہیں۔"

"ہاں جیجی! برابر (صحیح) کہتی ہیں آپ۔"

"پتہ نہیں کیا بات ہے پھاپی! کبھی کبھی میرے دل میں ہول اٹھنے لگتے ہیں۔ دل کرتا ہے اپنی فردوس ان کے حوالے نہ کروں مگر ایک تو عبداللہ کے ساتھ اس کا نکاح ہو گیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ بڑے سائیں نے زبان دی ہوئی ہے، کیسے پھروں اس زبان سے؟" ان کے دل کی بات آخر زبان پر آ ہی گئی۔

"جیجی! آپ تو خوامخواہ ہول رہی ہیں۔ اب بھلا جیجی فردوس کوئی غیروں میں تھوڑی جا رہی ہے۔ اپنے چاچے کے ہاں ہی تو جا رہی ہے۔ وہ اس کا باپ جتنا ہی خیال رکھے گا۔" پھاپی کی تسلی پر وہ پھیکی ہنسی ہنس دیں۔

"پھاپی! ماسی نہ ماں، چاچا نہ باپ۔ ارے جھلی کس زمانے کی بات کرتی ہے۔ اب تو سگے رشتوں کی بھی خوشبو ختم ہو گئی ہے۔ خوامخواہ کی توقعات رکھ کر کیوں اپنے آپ کو کانٹوں سے زخمی کرواؤں؟" ان کے کہنے پر پھاپی تائیداً زور زور سے سر ہلانے لگی۔

☆ ☆ ☆

وہ فجر کی نماز پڑھ کر یاسین شریف کا ورد کر رہی تھیں۔ تب ہی پھاپی دوڑتی آئی۔

"جیجی! وہ... وہ چھوٹے سائیں والے چلے گئے۔"

بی بی مریم نے جزدان کا کونا بطور نشانی صفحے میں ڈال کر یاسین رحل پر رکھی۔

"کہاں چلے گئے؟"

"پتہ نہیں کہاں گئے۔" وہ ہانپ رہی تھی، گھر سے دوڑتی ہوئی آئی تھی۔

"کہاں چلے گئے۔ ارے گئے ہوں گے کہیں کسی دعوت پر برادری میں۔"

"نہیں جیجی! نہیں۔" وہ ہاتھ دائیں بائیں ہلاتے ہوئے بولی۔ "وہ تو سامان بھی ساتھ لے گئے۔ سارے لوگ چلے گئے گاؤں چھوڑ کر۔"

"کیا کہہ رہی ہو، گاؤں چھوڑ گئے۔ کس نے کہا تم سے؟" بی بی مریم حواس باختہ چارپائی سے اتر آئیں۔

"وہ شیدا گیا تھا، زمینوں کو پانی دینے۔ فجر دیلے واپس

آرہا تھا تو تین ٹرک سامان کے دیکھے۔ اس سے پہلے سائیں عبداللہ کی کارگزری تھی۔ اس نے مجھے بتایا تو بس میں دوڑ کر چھوٹے سائیں کی حویلی گئی۔ وہاں گیٹ پر موٹا سا تالا پڑا ہوا تھا۔ تب ہی میں دوڑ کر ادھر آئی۔" اس کی بات بے ربط اور لہجہ روہانسا تھا۔

بی بی مریم کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"تم جلدی جاؤ' بھا غلام رسول کو بلا لاؤ۔ جلدی کرو۔" وہ برآمدے میں آگئیں۔

بھابی عجلت میں نکل گئی۔ بی بی مریم اضطراب و بے چینی سے ٹہلنے لگی۔

"ابھی کل ہی تو فردوس کے ستاڑے (شادی کا ساتواں دن) کی رسم تھی۔ سب ہی خاندان کے لوگ آئے تھے۔ ادا غلام نبی کتنا خوش دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ اس نے ساری کدورتیں دل سے نکال دی ہیں مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ دکھاوے کا جال ہے۔ میری فردوس مجھ سے چھین کر لے جائے گا۔ واہ ادا! تو تو شکاری نکلا۔" آنسو ان کے گالوں پر پھسلتے رہے۔

وچھوڑے کا تیر چلا کر کیسی مات دی ہے۔

"ادی' ادی! یہ بھابی کیا کہہ رہی ہے۔ ادا غلام نبی والے گھر چھوڑ گئے؟" غلام رسول بوکھلایا ہوا اندر داخل ہوا۔

"ہاں بھا! وہ میری فردوس کو مجھ سے دور لے گئے۔ جاؤ ان کے پیچھے' کہیں ڈھونڈو انہیں' واپس لے آؤ۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"ادی! دل بڑا کرو' ہم ان کو جانے تھوڑی دیں گے۔ ڈھونڈ کر لے آئیں گے۔ آخر وہ گئے کس وقت ہیں؟" بی بی مریم کو دلاسا دے کر مڑتے ہوئے بھابی سے استفسار کیا۔

"سائیں! فجر کے وقت۔"

"اچھا۔ اچھا ٹھیک ہے۔"

"ادی! ایک گھنٹہ تو ہو گیا ہو گا۔ گاڑیاں تو پتہ نہیں کہاں تک پہنچ چکی ہوں گی مگر میں جاتا ہوں۔ آس پاس میں بھی لوگ بھیج کر خبر رکھواتا ہوں۔ بس تم دعا کرنا۔"

"بھا! خدا تمہیں کامیاب لوٹائے۔" بی بی مریم ان کے پیچھے دعائیں کرتی رہیں مگر صبح سے شام ہو گئی' انہوں نے افطاری کے وقت دو گھونٹ پانی سے روزہ کھولا تھا پھر جا کر مصلے پر بیٹھ گئی تھیں اور جب عشاء کے وقت غلام رسول شاہ سر جھکائے گھر میں داخل ہوا تو بی بی مریم کو لگا کہ جیسے ان کی سانس رک گئی ہو۔

پھر دن گزرتے رہے' عید آگئی مگر ان سب کا پتہ نہ چلا۔ ہر جگہ سے پتہ کروایا۔ سارے جاننے والوں سے معلوم کیا مگر پتہ نہیں وہ کس کونے میں جا کر چھپ گئے تھے۔

عید کے دن بھی وہ برادری میں سویاں بھیجتے ہوئے روتی رہیں۔ بار بار انہیں فردوس یاد آجاتی۔ کیسے اپنی سہیلیوں کے تحفے تیار کرتی تھی' نوراں کے سر پر کھڑی ہوتی۔ یہ بناؤ' وہ بناؤ۔ سب چیزیں تیار کروا کر اپنی سہیلیوں کا انتظار کرتی۔ وہ آتیں تو ان کے ساتھ باتوں میں مگن ہو جاتی' تب وہ اپنی بیٹی کو چپکے چپکے خوشیوں میں مگن دیکھتیں تو ان کی دائمی رہنے کی دعائیں کرتیں۔ وہ عید کے دن اپنی بیٹی کو یاد کر کے روتی رہیں۔ اس عید کے بعد اور عیدیں بھی گزر گئیں مگر فردوس کا پھر کچھ پتہ نہ چلا۔

چند سال بعد جب عطا رسول کی شادی ہوئی تو ہر موقع اور رسم پر انہیں فردوس یاد آئی۔

ان کی بہو غلام رسول شاہ کی بیٹی تھی۔ وہ بھتیجی کو دل و جان سے چاہتیں' بیٹی کی کمی تو پوری نہیں ہوئی مگر انہیں بہو کی صورت میں دوسری بیٹی ضرور مل گئی تھی۔

جب شاہ مراد کی پیدائش ہوئی تو اس دن بھی وہ ایک بار پھر شدت سے روئی تھیں۔ پانچ سال کے بعد جب نور العین پیدا ہوئی تو ان کا زخم ایک بار پھر ہرا ہو گیا۔

نور العین کی بڑھتی عمر کے ساتھ فردوس کی یادیں بھی جوان ہوتی گئیں۔ وہ اب پوتی میں بیٹی کو ڈھونڈنے لگیں۔ اس کا چلنا پھرنا' بیٹھنا فردوس ہی کی مانند تھا مگر یہ اوائل عمری ہی تک رہا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ اس کی شبیہہ تو فردوس جیسی ہی رہی مگر طبیعت میں جولانی آگئی۔ فردوس خاموش صابر' سنجیدہ رہنے والی لڑکی تھی جبکہ نور العین ضدی اپنی بات ہر صورت منوانے والی' ہر وقت ہلا گلا مچائے رکھتی۔ تب بی بی مریم سوچتیں۔ شاید اس کا نصیب فردوس سے اچھا ہو۔ بی بی مریم اس کی ڈھال تھیں۔ اس کی ہر جائز' ناجائز بات پوری کرتیں۔ کسی کو اس پر روک ٹوک کا اختیار نہیں تھا۔ نتیجتاً وہ ضدی' خود سر اور متکبر ہوتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

برآمدے میں پڑے جھولے میں بیٹھے عطا رسول مطالعے میں منہمک تھے۔ تخت پر بیٹھیں بی بی مریم عصر کی نماز کے بعد تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

صحن میں برآمدے کے ستون کے ساتھ لگی کرسی پر بیٹھی نور نے دادی اور باپ کو مشغول دیکھ کر بوریت سے منہ بنایا۔ تھوڑی کے نیچے بایاں ہاتھ رکھ کر کہنی کرسی کی ہتھی پر ٹکائی اور حویلی کی بیرونی دیوار پر بیٹھے کوؤں کو ایک بار پھر گننے لگی۔

"پچیس' ستائیس' اکتیس۔" اس نے اڑتے ہوئے چار کوؤں کو گنتی میں شمار کیا۔

"امیراں! آج کل کوے اتنے زیادہ کیوں نظر آرہے ہیں؟" اس نے گنتی سے اکتا کر ملازمہ سے پوچھا۔

"ننڈھی (چھوٹی) جیجی! ساریوں (چاولوں) کی کٹائی ہو گئی ہے نا' اسی لیے یہ رزق کی تلاش میں گھروں پر منڈلاتے پھرتے ہیں۔" چاول چنتی ہوئی امیراں نے سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"امیراں! دوپہر کی بچی ہوئی روٹی کوؤں کو ڈال دو۔" امیراں' بی بی مریم کے کہنے پر چاولوں کا تھال اٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

"تم آج اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟ کب سے بور ہو رہی ہوں میں۔" اس نے اپنی خاص ملازمہ نجو کو ڈانٹا۔

"جیجی! میں کیا کرتی' اتنے سارے کپڑے دھونے تھے۔ سارا دن نکل گیا پھر بھی کچھ باقی رہ گئے۔" وہ ہاتھ لہرا کر بولتے ہوئے اس کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔

"نجو! (تمہاری ماں) کی طبیعت کیسی ہے۔ اس کا بخار گیا کہ نہیں؟" بی بی مریم نے تسبیح مکمل کر کے استفسار کیا۔

"جیجی اماں! اب کچھ فرحت ہے اس کو۔" بی بی مریم نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

"نجو! یہ کوے آج کل حویلی کے کچھ زیادہ چکر نہیں لگا رہے؟" نور نے کوؤں کو روٹی ڈالتی نوراں کو دیکھ کر با آواز سرگوشی کی۔

"پتہ ہے جیجی! یہ نوراں پہ عاشق ہیں' تب ہی دیدار کو آتے ہیں۔" اس کے استہزائیہ کہنے پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اچھا اتنی چھوٹی آنکھوں سے کوؤں کو وہ نظر آجاتی ہے؟"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں جیجی! اس کی آنکھیں کون سی بڑی ہیں۔ کوؤں کی آنکھوں جتنی تو ہیں۔ بس نظروں سے نظریں ملتی ہیں تو قرار آجاتا ہے۔" اس نے تالی بجا کر اونچے انداز میں کہا۔ نور کے قہقہے شروع ہو گئے۔

نوراں نے مڑ کر انہیں دیکھا پھر خاموشی سے چنگیر میں پڑے ہوئے ٹکڑے زمین پر ڈالنے لگی۔

عطا رسول نے کتاب سے نظریں ہٹا کر ناگواری سے ان دونوں کو ہنستے ہوئے دیکھا۔ ٹوکنا چاہتے تھے مگر بی بی مریم کو دوپٹہ منہ پر رکھے ہنسی دباتے دیکھا تو غصے سے لب بھینچ لیے۔ باورچی خانے میں جاتی نوراں کی پشت کو دیکھ کر سوچنے لگے کہ نور کی بدتمیزیاں اب عیب جوئی تک بھی پہنچ گئی ہیں۔

اب بھی اسے ٹوکا نہ گیا تو پتہ نہیں وہ کس حد تک جائے۔ اس کی اصلاح اب ضروری ہو گئی ہے۔ وہ سوچتے ہوئے جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گئے۔

"نوراں!"

"جی بابا سائیں!" وہ دوڑتے ہوئے آئی۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب اسے تھمادی۔

"یہ اندر کتابوں والے کمرے میں رکھ دو۔"

"بابا سائیں! میز پہ؟" اس کی سہمی ہوئی آواز پر انہوں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"نہیں بیٹا! وہ جو کھڑکی کے پاس شیلف یعنی الماری ہے نا' جہاں حدیث کی کتابیں رکھی ہیں' ان کے برابر میں یہ کتاب بھی رکھ دو۔" وہ اسے کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

نوراں کو بیٹا کہنے پر انہوں نے نور کے چہرے پر حیرت دیکھی تھی' جبکہ نجو نے مذاق اڑانے والے انداز میں ہاتھ منہ پر رکھا تھا۔ یہ منظر ان کی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا مگر یہ ابتدا تھی' آج کے لیے یہ کافی تھا۔ وہ سوچ کر مسکرا دیے۔

☆ ☆ ☆

امیراں کی طبیعت صبح سے ہی خراب تھی۔ وہ بار بار نوراں سے کہتی کہ وہ حویلی جا کر کام کرے اور اس کی طبیعت کی خرابی کا بھی بتادے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور خاموش بیٹھی رہی۔

"او نوراں! آخر جاتی کیوں نہیں' کیوں تنگ کر رہی ہے صبح سے؟" امیراں جو چارپائی پر لیٹی تھی' اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دوپٹے کی گرہ ڈھیلی کر کے پھر زور سے کھینچ کر ماتھے پر باندھی۔

"بولتی کیوں نہیں؟ کیا منہ میں مونگ پڑے ہوئے

ہیں۔" امیراں جھنجلا گئی۔

"اماں! ادھر میں اکیلی نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں اکیلی نہیں جاؤں گی؟ کوئی کھا تو نہیں جائے گا۔" امیراں حیرت سے بولی۔

"وہ چھوٹی جیجی اور نجو مل کر میرا مذاق اڑاتی ہیں۔ تمہارے سامنے تو کچھ لحاظ کر لیتی ہیں۔"

"لو یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ اگر چھوٹی جیجی ہنس بول لیتی ہیں تو کیا ہوا' تو مر تھوڑی جاتی ہے۔ یہ صرف کام نہ کرنے کے بہانے ہیں۔" امیراں چڑ گئی۔

"اماں! کام کی بات نہیں ہے۔ جتنا چاہے کروالو' پر مجھ سے اب اپنی بے عزتی برداشت نہیں ہوتی۔"

"ذرا سن' نوراں کے ابا! کیا کہتی ہے تیری بیٹی۔ بابا سائیں کی بیٹی کا ہنسی مذاق کرنا اب اسے اپنی بے عزتی لگتا ہے۔ یہ حویلی جا کر کام کرنے سے انکاری ہے۔" وہ گھر میں داخل ہوتے غلامو کے آگے دل کی بھڑاس نکالنے لگی۔

"چھوری! پاگل تو نہیں ہو گئی ہے۔ ارے ہماری سات پیڑھیاں ادھر نوکری کر کے مر گئیں۔ اب مرشدوں کی بات بھی تمہیں بری لگتی ہے' اوقات پہچان اپنی۔ ارے غلامو مچھیرے کی بیٹی ہے تو' جس نے ساری عمر بابا سائیں کی غلامی کی ہے۔" غلامو کے غصے کو دیکھ کر وہ سہم گئی تھی۔

"کیسا بے حیائی کا دور آگیا ہے۔ ور کے غلاموں کو اب مالکوں کی بات بری لگتی ہے۔ دیکھ نوراں! میں کہے دیتا ہوں۔ خبردار۔ تو کوئی برائی کی بابا سائیں کی حویلی میں۔ ارے زبان کاٹ دوں گا میں تیری۔ کتا بھی مالک پر نہیں بھونکتا جب تک پاگل نہ ہو جائے۔ چل اٹھ' جا حویلی کتنا بج (سورج) چڑھ آیا ہے۔ جیجی اماں! انتظار کر رہی ہوں گی۔ سارا کام کھٹائی میں پڑا ہو گا۔" باپ کے کہنے پر وہ دل ہی دل میں کڑھتی باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

دھریاں تی دھاریاں' مٹ موئی جانے تھیا
مدی ڈیرن من میں آؤں کھلیو کھیکاریں
صبح تھی ساریاں' نہ اٹھ نہ اوطاقن میں

(جو ازل سے غیر بیگانے رہے' وہ اس مٹی (بدبخت بدنصیب) کے عزیز رشتے دار نہ بن سکے۔ برائی' غصہ' ہمیشہ تو دیوروں کے من میں تھا۔ میں تو ہنس کر انہیں مرحبا' خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ صبح طلوع سورج کے وقت جا پہنچتی ہوں تو پتہ لگتا ہے کہ پڑوسیوں کے اونٹ تو اوطاقوں میں ہی نہیں ہیں۔)

وہ سالوں سے یہ بیت پڑھتی آرہی تھی جس میں شاہ لطیف نے سسی کا دکھ سر معذوری میں بیان کیا ہے۔

"حق... ہا... تپش تو تپش ہے۔ ساری ہی بری ہوتی ہے مگر آنڈے (اولاد) کی تپش (دکھ) ہر تپش سے بری ہوتی ہے' جگر ہی جلا دیتی ہے' بھا بھڑ چلتا ہے پیٹ میں۔ شالا کسی کی بیٹی بھی دکھی نہ ہو۔" بی بی مریم کہتے ہوئے رو پڑیں۔

"سچ کہتی ہو جیجی! خدا کسی کو بھی بیٹی کی جدائی نہ دے۔" فرش پر بیٹھی ہوئی بھاپی نے سرد آہ بھری۔ نوراں ان کو روتا دیکھ کر خاموشی سے برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

بی بی مریم نے چشمہ اتار کر دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھیں پھر دوبارہ چشمہ لگاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے نوراں کو دیکھا۔

"جیجی اماں! آج اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' اس لیے وہ کام پہ نہیں آئی۔ آپ مجھے کام بتا دیجئے۔" اس نے بی بی مریم کو اپنی طرف دیکھتے پا کر جلدی سے کہا۔

"انصاف ہے مائی!" بی بی مریم کے بولنے سے پہلے ہی بھاپی نے شہادت کی انگلی نچلے لب پر رکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔ "تمہاری ماں کو یہ یاد گیری اب آئی ہے' جب ناشتے کا وقت تنگ ہو گیا ہے۔ باہر اتنے سارے مہمان ناشتے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں جو بابا سائیں کے پاس دعا دوا کے لیے آئے ہیں' ان کا ناشتہ بھیجنا تو لازمی ہے اور تمہاری ماں نے عین وقت پر جواب بھجوا دیا۔ بیمار ہی تھی تو پہلے بتایا ہوتا۔" بھاپی طنزیہ انداز میں ہاتھ نچا نچا کر بولی تھی۔

وہ ہراساں ہو گئی' کیسے بتاتی کہ اس کی ماں تو اسے صبح سے کہہ رہی تھی مگر وہ ہی آنے پر تیار نہیں تھی۔

"کنوار... او کنوار!" بی بی مریم نے بھاپی کے اتنا کچھ سنانے پر اسے کچھ اور کہنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے بہو کو آواز دی۔

"جی جیجی پھپھو!" ساس کی آواز پر وہ کمرے سے باہر نکلی۔

"اماں کنوار! ذرا باورچی خانے میں جا کر اپنی نگرانی میں ناشتہ تیار کروا کر باہر اوطاق میں بھجواؤ۔ آج امیراں نہیں آئی' نوراں کو صحیح پتہ نہیں چلے گا۔ جاؤ بھاپی! تم بھی ہاتھ بٹاؤ تاکہ جلدی سے کام ہو جائے۔" وہ جیجی اماں کی ہدایات پر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

"نوراں! تم روٹیاں ڈال دو' میں سالن بناتی ہوں۔" بھاپی نے اس کے پیچھے باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

بھاپی تیزی سے پیاز چھیلنے میں مصروف تھی' جیجی کنوار نے شاپر میں سے آلو نکال کر' برآمدے میں آتی نور کو دیکھا جو طوطے کے پنجرے کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔ نوراں نے باورچی خانے کی کھڑکی سے ان کی نظروں کا تعاقب کیا۔

"نورا! ذرا فریج میں سے گوشت نکال لاؤ۔" ماں کی آواز پر نور نے گردن موڑ کر باورچی خانے کی طرف دیکھا۔ نوراں جھک کر سرعت سے آٹا گوندھنے لگی۔

"نجو... او نجو...!" نور کی آواز جھنجلاہٹ بھری تھی۔

"جی جیجی! کیا بات ہے؟" وہ جھاڑن ہاتھ میں لیے کمرے سے نکلی۔

"فریج میں سے گوشت نکال کر اماں کو دے آؤ۔"

"تکڑے تکڑے (جلدی جلدی)" نور کے کہنے پر مٹھو نے پنجرے میں سے آواز دی۔ نور ہنس پڑی۔

نجو نے کمر پر ہاتھ رکھ کر مٹھو کو ایک عدد گالی سے نوازا اور فریج کی طرف بڑھ گئی۔ نور کے قہقہے بلند ہوئے۔ نجو نے گوشت دیتے ہوئے گھور کر نوراں کو دیکھا۔ بھنویں اور کندھا اچکا کر "اونھوں" طنزیہ انداز میں کہہ کر باورچی خانے سے باہر نکل گئی۔

بی بی کنوار نے پہلے حیرت سے نجو کو پھر آٹا گوندھتی نوراں کو دیکھا مگر وہ کچھ بھی سمجھ نہ سکیں۔

نوراں نے نظر بچا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ نجو نور سے کچھ کہہ رہی تھی۔ نور کو اپنی طرف دیکھتے پا کر جلدی سے لکڑیاں اٹھا کر چولہے کی طرف آئی۔

"اماں! آپ جائیں' میں کرتی ہوں آج نگرانی۔" اس نے نور کی آواز سنی مگر مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ خاموشی سے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں توڑ کر چولہے میں ڈالنے لگی۔

"پتہ ہے چھوٹی جیجی! آج کل ایک نئی وبا پھیلی ہے۔"

"وبا...؟ کون سی وبا؟" نور کی حیرت بھری آواز ابھری۔

"جلنے کی۔" نجو کی بات کا مطلب سمجھ کر وہ ہنسنے لگی۔ نوراں کی لکڑیاں توڑنے کی رفتار میں تیزی آگئی۔

"سی۔" انگلی میں لکڑی کا ایک باریک ٹکڑا چبھ گیا۔ خون کا قطرہ نکل آیا۔ اس نے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے زخمی انگلی دبا کر چند قطرے اور نکالے۔

"ہوش کر لڑکی! دھیان سے' لکڑیاں کہیں بھاگی تو نہیں جا رہیں۔" بھاپی نے ڈپٹ کر کہا۔

اس نے دوپٹہ انگلی پر رکھ کر خون بند کیا پھر چھوٹی لکڑیوں پر بڑی لکڑیاں رکھنے لگی۔

"بھاپی! پیاز جلنے کی بو آرہی ہے۔"

"نا چھوٹی جیجی! یہ بو ادھر سے آرہی ہے۔" نجو نے گوشت کاٹتے ہوئے نوراں کی طرف اشارہ کیا۔ نور' بھاپی اور نجو کا مشترکہ قہقہہ ابھرا۔

اس نے چھوٹی لکڑیوں کو جلتے دیکھا جو بڑی لکڑیوں کو آگ دے رہی تھیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی طنزیہ باتیں بھی ان چھوٹی لکڑیوں کی طرح ہوتی ہیں جن کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ان کا کام آگ بڑھانا ہی ہوتا ہے۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی رنجشوں کی بنیاد بن کر دلوں میں دراڑیں' گھروں میں دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں تو خاندانوں کا بٹوارہ' محبتوں میں خسارہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ وہ ان کی طنزیہ باتوں سے لاتعلق اپنی سوچ میں مگن ہو گئی۔ چونکی اس وقت جب بی بی کنوار نے آکر کہا۔

"ارے نوراں! تیری انگلی کو کیا ہوا' پٹی بندھی ہوئی ہے۔"

"جیجی! کانٹا چبھ گیا۔"

"درد تو نہیں ہو رہا۔" انہوں نے ہمدردی سے پوچھا۔

نوراں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ درد جسم میں نہیں' روح میں ہو رہا ہے جو صرف مجھے ہی دکھتا ہے۔ میں ہی محسوس کر سکتی ہوں مگر میری بھولی ماں کہتی ہے۔ چھوٹی جیجی کی ہنسی سے تو مر تھوڑی جائے گی۔ میری بھولی ماں کو یہ بھی پتہ نہیں کہ طنز سے جسم نہیں' دل مرجاتا ہے۔ مرجھا کر سوکھے گلاب کی مانند ہو جاتا ہے۔ جس میں نہ تازگی رہتی ہے' نہ خوشبو۔" اس نے اپنی سوچ کو بین کرتی عزتِ نفس کے پہلو میں پھینکا اور تیزی سے روٹیاں ڈالنے لگی۔

☆ ☆ ☆

میں نوراں ہوں' ملاح زادی نوراں' نیچ ذات کا لقب میرے ساتھ نسل در نسل چلا آرہا ہے۔ میں نے کوئی قصور

نہیں کیا۔ کوئی گناہ مجھ سے سرزد نہیں ہوا مگر پھر بھی مچھیرن کا طعنہ بچپن سے سماعتوں میں ٹھہر گیا ہے۔ مچھیرن کوئی گالی نہیں مگر کہنے والوں نے میرے لیے اسے گالی بنا دیا اور یہ گالی کہیں اور وجود میں نہیں آئی۔ بابا سائیں کی حویلی میں پلی بڑھی' اس کو پالا نوری بی نے' نجو نے' پھاپی نے اور ہر اس عورت نے جو حویلی میں چار دن بھی رہنے آتی تو مجھے نوراں کے بجائے لوئے مچھیرن کہہ کر بلاتی۔

میرا باپ کہتا ہے۔ "ہم میر بحر ہیں' پانی کے میر۔" اور میں ہنستی ہوں کہ میرا باپ کتنا بھولا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب بچپن میں نوری بی نے مجھے مچھیرن کہا تو میں اس سے لڑ پڑی تھی مگر اس کے بعد جو پٹائی میری اماں نے کی کہ پھر مجھے نوری بی سے لڑنے کی' جواب دینے کی ہمت نہیں ہوئی۔

"لگتا ہے یہ چھوری اپنی تو عاقبت خراب کرے گی ساتھ میں ہماری بھی آخرت خراب کرکے رہے گی۔ نجات نہیں ہوگی اس کی۔ سیدوں کے آگے بولتی ہے' ان سے لڑتی ہے۔ بیبی! پتہ نہیں یہ چھوری کس پر گئی ہے۔ ہم نے تو کبھی سر اٹھا کر آپ لوگوں سے بات تک نہیں کی۔ چاہے آپ کچھ بھی کہہ دیں۔" اماں' بیبی اماں کے پاؤں پڑ کر گناہ بخشوا رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں امیراں! یہ ابھی بچی ہے' سمجھ جائے گی۔" بیبی اماں نے اپنے پیروں سے اماں کے ہاتھ ہٹا کر کہا۔

"امیراں! اب چھوڑ اس قصے کو۔ بچے تو آپس میں لڑتے ہی رہتے ہیں' تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔" بیبی کنوار نے میرے سر پر مسکرا کر ہاتھ پھیرا تھا اور میں ایسے مجرم کی طرح کھڑی تھی جس کو اپنی سزا پر کامل یقین ہو مگر منصف سچائی کی روح کو چھو کر اسے زندگی کی بہار سے آشنائی دے دے۔

اس کے بعد آنے والے سالوں کے دامن میں' خاموشی کے پلوے' میں چپ کے انگارے باندھ کر' صبر کے شعلوں پر من کو مار کر' دل کی بھٹی میں کم ذات ہونے کے یقین کو پکاتی رہی۔ تب میری انا کی راکھ میں کم ذات کا شک بھی جل کر راکھ ہوا اور مجھے یقین کامل ہو گیا کہ ہم ارذل ہیں۔ آج سے نہیں' صدیوں سے۔ یہ ہمارا نصیب ہے' یہی ہمارا مقدر جس پر ہم صدیوں سے خوش ہیں۔ ناانصافی کا سوچ کر ہم ناشکری کے پھندے میں نہیں پھنسنا چاہتے۔ ہاں میں نے بھی اپنی قوم کی طرح اس بات پر یقین کر لیا تو پھر کیا کڑھنا ان طعنوں پر جو ہمیں اندر سے چھلنی کرتے رہتے ہیں۔

مجھے نہیں پتہ کہ آج تک کوئی ملاح اس غلامی کو قبول نہ کرتا ہو۔ غلامی جو کہ آپ سے' اپنا آپ' اپنا مان' ضمیر' عزت نفس بھی چھین لیتی ہے۔ سو ان سب احساسات سے منکر ہو کر میں بھی غلام بن گئی' اس لیے کہ میں غلام مچھیرے کی بیٹی ہوں جس کی پشت در پشت ہزاروں سالوں سے غلامی کے حصار میں قید' پر قانع چلی آ رہی ہے' تب وہ اپنے دل کے بہلانے کو کہتے ہیں کہ ہم میر بحر ہیں' پانی کے بادشاہ۔

☆ ☆ ☆

وہی بنی اسرائیل جو کہ آخری نبی کے مبعوث ہونے کی دعائیں مانگتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے سے انکاری ہو گئے۔

کیوں انکاری ہو گئے۔

ان کے ایمان نہ لانے کی وجوہات میں نبیوں کی بہتات یعنی باپ نبی' بیٹا نبی' بھائی نبی' دادا نبی' پوتا نبی' بنی اسرائیل میں بے شمار نبی ہونے کا فخر' اللہ کی پسندیدہ قوم ہونے کا غرور اور سارے بنی آدم میں افضل ہونے کا تکبر شامل تھا۔

اب آپ سوچیں گے کہ آخر میں نے اتنی لمبی تمہید کس لیے باندھی ہے۔ میں آپ کو سمجھاتا ہوں' میں سید غلام نبی شاہ' سید عبدالعلی شاہ کا چھوٹا بھائی ہوں اور سوتیلا بھی۔ میری ماں برادری کے ایک غریب سید کی بیٹی تھی۔ میرے نانا اپنی بیرنسی کی وجہ سے میری ماں کا رشتہ سجادہ نشین عطار سول شاہ اول کے پاس لے آیا کہ میری بیٹی آپ اپنے نکاح میں لے لیں۔ میرا سوتیلا بھائی عبدالعلی شاہ مجھ سے عمر میں دس بارہ سال ہی بڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ میری ماں سے زیادہ ماسی (عبدالعلی کی ماں) کی حیثیت تھی۔ وہی گھر کی بڑی تھی۔ اسی کی حکمرانی گھر پہ چلتی تھی اور یہ تو طے ہے کہ جس گھر میں دو سوکنیں ہوں' وہاں لڑائی ضرور ہوگی۔ یوں گھریلو لڑائیوں میں دن گزرتے گئے کہ اچانک جب بارہ سال کی عمر میں یتیمی کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر ٹوٹ پڑا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ عبدالعلی شاہ کی شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ میدان کی زمین ہموار کی جا رہی تھی۔ جہاں شامیانے لگنے تھے' ذبح ہونے والے ڈھور ڈنگر باڑے میں پہنچ چکے تھے۔ پورے گاؤں میں خوشی کا سماں تھا مگر جو انسان سوچتا ہے وہ ہوتا نہیں۔ شادی سے ٹھیک پندرہ دن پہلے' میرے باپ کا انتقال ہو گیا۔ شادی کی خوشیوں پر غم و سوگ حاوی ہو گیا۔ ادا کی شادی ملتوی ہو گئی اور پھر ادا عبدالعلی ذمہ داریوں میں ایسے پھنسے کہ ان کی شادی چند سال تک نہ ہو سکی۔ وہ یتیمی کا بوجھ جو مجھے اٹھانا تھا' وہ بھی ادا نے اٹھا لیا۔ میری پرورش اور تعلیم کی ذمہ داری کو انہوں نے بخوبی نبھایا۔ میرے جوان ہونے تک میرے گھر کا راشن پہنچانا' میری اور اماں کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا۔ ادا' ماسی اور اماں کے جھگڑوں کے بیچ کبھی بھی نہ بولے۔

چھ سال بعد جب میری عمر اٹھارہ سال ہوئی تو ادا کی شادی کی تیاریاں پھر سے شروع ہو گئیں مگر اس سے پہلے ادا نے ایک اہم کام یہ کیا کہ میرے حصے کی زمین میرے نام کر دی۔ مال مویشی میں جو حصہ میرا بنتا تھا' وہ الگ سے باڑہ بنا کر مجھے دے دیا۔

میں نے مارے شرم کے ان کو کہا بھی۔

"ادا! میں نے آپ سے حصہ تو نہیں مانگا۔" تو وہ مسکرا کر بولے۔

"غلام نبی! میں نے تمہارا حصہ اس لیے جلد دے دیا کہ کل کلاں کو اگر میری اولاد ہو جائے تو میں حرص کا شکار نہ ہو جاؤں کہ میری اولاد کو بھی ملکیت میں حصہ دار بننا چاہیے۔ کہیں میں انسان کی فطری کمزوری کا شکار ہو کر تمہارا حصہ کم نہ کر بیٹھوں۔ اس بہانے کہ میں بڑا ہوں' مدرسہ خانقاہ اور لنگر کا انتظام میرے پاس ہے۔ مجھے جائیداد میں زیادہ حصہ لینے کا اختیار بھی ہے اور حق بھی۔ کہیں ان دلیلوں سے متاثر ہو کر میں تمہارے ساتھ ناانصافی نہ کر بیٹھوں۔ مجھے ڈر لگتا ہے اپنے نفس سے۔ میری مان تو تو بھی اب شادی کر لے۔" ادا کی بات پر میں نے مسکرا کر سر جھکا دیا مارے شرم کے مجھ سے اور کچھ بولا ہی نہ گیا۔

مگر یہ بات اماں کے کانوں تک پہنچ گئی۔ نتیجتاً ادا کی شادی کے بعد دوسرے سال میرے پاؤں میں بھی یہ زنجیر ڈال دی گئی۔

یوں ہی وقت گزرتا رہا' یہ عجیب اتفاق تھا کہ ادا کے ہاں پہلے بیٹی کی پیدائش ہوئی اور میرے ہاں بیٹے کی۔ چند سال بعد ادا کو بیٹا ہوا تو اس کا نام بابا کے نام پر رکھا گیا۔ حالانکہ اس سے پہلے میرے ہاں بیٹا ہوا تھا مگر چونکہ ادا بڑا تھا۔ سجادہ نشین تھا۔ رسم روایت کے مطابق گدی نشین کا نام بھی گدی نشین ہی رکھتا' اس لیے میں نے بیٹے کا یہ نام نہیں رکھا۔ اگر میں رکھتا بھی تو مجھے یقین تھا کہ ادا اس پر اعتراض نہیں کرتے مگر جو گھریلو جھگڑے تھوڑے بہت رکے تھے' وہ پوری شدتوں سے شروع ہو جاتے۔ گزرتے وقت میں بچوں کے جوان ہونے پر میں نے ادا کے سامنے جھولی پھیلائی تو انہوں نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ یوں عبداللہ شاہ اور فردوس کی منگنی کے بجائے نکاح کی تقریب رکھی گئی۔ ادا بہت خوش تھے' ان کے سر سے جیسے بوجھ اتر گیا تھا پھر ایک سال بعد ہی ادا کا انتقال ہو گیا۔ عارضی طور پر ادا کا سارا کام میں نے سنبھال لیا' تب ہی مجھ پر حرص کا غلبہ ہوتا چلا گیا۔ میں نے لوگوں کی محبت اور عزت گدی نشین سے دیکھی تو مجھے اس عزت اور نذرانوں کا چسکا پڑ گیا۔ میرا بھتیجا چھوٹا تھا' کسی بھی طرح کا انتظام سنبھالنے کے قابل نہیں تھا۔ بظاہر سجادہ نشین بننے میں میری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی' اس لیے جاہ و عزت کے لیے میں یہ داؤ کھیلنے لگا۔

لوگ میرے آگے پیچھے پھرتے، مجھے ہی اپنا مالک تصور کرتے، سائیں سائیں کہتے نہیں تھکتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ وہ مجھے پہلے سائیں نہیں کہتے تھے مگر جو سرور بڑے پن کا مجھے اب ملا تھا، وہ پہلے کبھی محسوس ہوا تھا۔

ایسے میں متکبر ہوتا چلا گیا۔ اسی تکبر میں جاہ و جلال کی خواہش میں وہ کچھ بھی کھو بیٹھا جو میرا حصہ تھا۔ ابلیس نے بھی جاہ و جلال ہی چاہا تھا۔ تب ہی آدم کے وجود کو برداشت نہ کرسکا۔ یوں اپنا پہلے والا مان مرتبہ بھی کھو بیٹھا۔

میرے ساتھ بھی یہی ہوا جو لوگ ابلیسی طرز فکر کو اپناتے ہیں، ان کا یہی انجام ہوتا ہے۔ جس فطری کمزوری کا شکار ہونے سے اداؤر تا تھا، اسی کا میں شکار ہو گیا۔ وہ اپنے بچوں کی پیدائش سے پہلے مجھے جائیداد دے گیا اور میں اس کے بچوں سے ان کا حق چھیننے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔

ہاں وہ عبد العلی تھا جس کو اپنے نفس سے ڈر لگتا تھا اور میں غلام نبی جس نے اپنے نفس کو شیطان کا ہمنوا بنا ڈالا۔ وہ بھائی جس نے میرے ساتھ کبھی ناانصافی نہیں کی۔ میں اس کے بچوں کے ساتھ ناانصافی کرنے لگا۔ تاہم بھاجائی مریم کی دخل اندازی پر ایسا ہوتے ہوتے رہ گیا۔

بات صرف گھر تک رہتی تو ٹھیک تھی مگر بات تو گھر کی دہلیز سے باہر پہنچ چکی تھی۔ کسی بھگوڑی لڑکی کی طرح جس کو پھر وہی عزت نہیں ملتی، برادری مریدوں وغیرہ کی چہ میگوئیاں میرے قریب سے گزرتیں اور موسم سرما کی ہوا کی مانند میرے کانوں کے پردے ہی پھاڑ ڈالتیں ہیں۔

عطا رسول کے پگ باندھنے پر میرے اندر انتقام کا جذبہ بڑھتا چلا گیا۔ ہاں، اگر آپ مال و جاہ حاصل کرنے میں ناکام رہیں تو پھر نہ ملنے کا انتقام ہی بچتا ہے۔ سو میں نے بھی اپنے انتقام کی شروعات کردیں۔ بھاجائی سے عبداللہ کی شادی کی تاریخ مانگنے چلا گیا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ سندھ کے رواج کے مطابق اب کوئی بھی خوشی برسی کے بعد ہی ہوگی۔ مجھے پتا تھا کہ بھاجائی انکار کردے گی مگر میں ان کی دل آزاری کا یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ یوں میں اپنے دل کی بھڑاس نکال کر چلا آیا۔

میں بھلا کیسے بھلا سکتا تھا وہ شکست جو ایک عورت کی حکمت عملی سے مجھے ملی تھی۔ مرد عورت کی ذہانت کو مکاری اور لیاقت کو واہیات پن سمجھ کر اس کی صلاحیتوں کو ماننے سے ہمیشہ انکار کرتا ہے۔ ہمارے خاندان میں عورتیں ہمیشہ مرد کے آگے سر جھکا کر دھیمی آواز میں بولتی ہیں تو میں بھاجائی کی یوں دخل اندازی کیسے برداشت کرپاتا؟

عبداللہ شاہ کی شادی کی تیاریوں کے ساتھ ہی میں نے نقل مکانی کی خفیہ تیاری شروع کردی۔ اس کے ساتھ ہی زمین بھی بیچ دی۔ لوگوں کے پوچھنے پر میں نے "کچھ زمین شادی کے خرچے کے لیے بیچی ہے" کا بہانہ کرکے لوگوں کو مطمئن کردیا۔

یوں عبداللہ کی شادی سے پہلے پہلے میں نے کراچی میں گھر اور دکانیں خرید لیں۔ کون سی میری بیٹیاں تھیں جن کی شادی کی فکر میں گاؤں نہ چھوڑتا۔ دو بیٹے ہی تو تھے۔ باقی عطاء اللہ تھا اور وہ ابھی چھوٹا تھا۔

عبداللہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ ساتویں دن ستاڑے کی رسم تھی۔ ہم سب بھاجائی کے ہاں مدعو تھے، تب پہلی بار بھاجائی مجھے کمزور محسوس ہوئی۔

"اب پتہ چلے گا بھاجائی کو کہ مرد کے مقابلے پر آنا اسے کتنا مہنگا پڑا ہے۔" میں نے طنزیہ سوچا تھا۔ بھاجائی کی خوش اخلاقی اور مہمان نوازی پر مجھے بے ساختہ ہنسی آرہی تھی۔ بیٹی دینے کے بعد والدین کتنے بے چارے ہو جاتے ہیں جیسے مفتوح فاتح کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔ میں شکر کررہا تھا کہ میری بیٹی نہیں تھی۔ ویسے بھی بیٹی ہمارے خاندان میں خوش بختی کی علامت کبھی نہیں رہی تھی۔

دوسرے دن سحری کے تڑکے عبداللہ اور فردوس کو شہر بھیج دیا اور خود سامان کے ٹرکوں کے ساتھ نکلا۔ مجھے یقین تھا کہ جب تک بھاجائی والوں کو پتہ چلے گا، لوگ ہمارے پیچھے آئیں گے، تب تک ہم بہت دور نکل جائیں گے اور وہ لوگ ہمیں قریبی شہر میں ڈھونڈیں گے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ہم کراچی جیسے بڑے شہر میں رہائش اختیار کریں گے اور ہوا بھی ایسا ہی۔ انہوں نے ہمیں قریبی شہروں اور قصبوں میں ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ تب تک ہم ان کی پہنچ سے دور ہو گئے۔

کراچی آکر فردوس سارے گھر میں بولائی بولائی چکراتی پھرتی۔ ہمارا برتاؤ اس سے محبت بھرا ہی رہا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ میری بھتیجی ہے۔ اس احساس کے تحت میں اس کو باپ کی شفقت دینے کی کوشش کرتا مگر اس کی اداسی میں کمی نہیں آئی۔ ہم کو تو وہ پہلے ہی کم تھی۔ اس کا صبر ہمارے حق میں جا رہا تھا۔ سارے گھر کی ذمہ داری اس نے سنبھالی ہوئی تھی۔ عبداللہ نے اسے بتایا تھا کہ ہم نے شہر میں کاروبار شروع کیا ہے۔ آنے سے پہلے اس نے بھاجائی سے ملنے کو

کہا تھا مگر عبداللہ نے اسے یہ کہہ کر بہلا لیا۔
"دیر ہو جائے گی' چند دن بعد تمہیں ملوانے لے آؤں گا اور ابھی کل ہی تو تم ان سے مل کر آئی ہو۔" وہ نئی دلہن تھی' اس لیے خاموش ہو گئی۔
یہاں آکر بھی کسی نے اسے احساس نہیں ہونے دیا کہ ہم نے گاؤں خاندانی رنجشوں کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے۔
اس نے عبداللہ کو وعدہ یاد دلایا مگر اس نے مصروفیت کا بہانہ کرکے اسے کچھ دنوں کے لیے ٹال دیا' پھر قدرتی طور پر ہمیں بہانہ مل گیا وہ امید سے تھی اور اب عبداللہ نے اسے لمبے سفر پر لے جانے سے صاف صاف انکار کر دیا۔
تب اس نے پہلی بار ہلکا سا احتجاج کیا تھا۔
عبداللہ نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ وہاں دائی ہو گی اور یہاں لیڈی ڈاکٹر جو تمہاری بہتر دیکھ بھال کر سکے گی۔ عبداللہ نے اسے دلاسہ دیا کہ جیسے ہی تمہاری ڈلیوری کے دن قریب آئیں گے میں انہیں لے آؤں گا۔
اور یوں ہم فی الحال اپنے انتقام کو اس سے پوشیدہ رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔
پھر ماجد کی پیدائش پر جب بھابی کو عبداللہ لینے کے لیے نہیں گیا۔ تب فردوس کو شک ہوا کہ بات کچھ اور ہے۔ گزرتے وقت نے یہ شک یقین میں بدل ڈالا۔
عبداللہ کے ساتھ اس کی چند لڑائیاں بھی ہوئیں۔ اس کے بعد اس نے چپ سادھ لی۔ شاید اسے صبر آگیا تھا۔
چند سالوں بعد ہی عطاء اللہ پڑھنے کے لیے امریکہ چلا گیا اور ماجد کے بعد گھر میں مہ جبیں' معراج اور ماہین کا اضافہ ہو گیا اور فردوس ان میں ایسی لگی کہ سب کچھ بھولتی چلی گئی یا ہمیں ہی اس کا دکھ نظر نہیں آتا تھا۔
پھر ہمارے گھر میں ایک آخری معرکہ ہوا' جب میری بیوی نے عبداللہ کو کہا کہ وہ فردوس کو کچھ دنوں کے لیے میکے چھوڑ آئے۔ اس کی آواز پہلی بار میرے آگے اونچی ہوئی تھی۔
"تو بھی تو عورت ہے۔ کتنے سالوں سے نہیں گئی ہو میکے۔" میں نے غصے سے کہا۔
"میں جاتی تو کس کے پاس۔ ماں باپ کو تو جیسے انتظار ہی میری شادی کا تھا۔ وہ ہوئی تو وہ چل دیے اگلے جہاں' ایک بڑی بہن تھی۔ تو اس کی شادی غیروں میں ہوئی' تو پھر بھلا میں کیسے جاتی۔ میں تو ـــــ غیر سیدوں میں سے تھی' تو کیسے سیدوں میں آکر ان کی عزت نہ رکھتی۔ پر یہ تو تیری

بھتیجی ہے' ایک ہی حسب نسب ہے۔ تو اس پہ کیوں اتنی روک ٹوک ہے۔"
"اچھا اچھا اب زیادہ بکواس نہ کر۔" میں نے طیش میں آکر زور سے کہا' اس لیے کہ میں اس کی دلیل پر لاجواب ہو گیا تھا۔
"اگر ادی مریم نے تمہیں پگاڑا نہیں بننے دیا' تو کون سا اتنا بڑا جرم کر لیا' جو حق تمہارا تھا ہی نہیں۔ وہ کیسے اپنے بیٹے سے چھینتے دیتیں۔" اس کی بڑبڑاہٹ پہ مجھے اور غصہ آگیا۔
"اگر فردوس کو میکے جانے کا اتنا شوق ہے تو چلی جائے' مگر نہ تو ہم اسے بچے دیں گے' اور نہ ہی وہ لوٹ کر اس گھر میں واپس آئے گی۔"
مرد اگر عورت کی دلیل سے ہار جائے تو اسے دھمکیوں سے دباتا ہے' میں نے بھی آخری حربہ آزمایا۔
عورت دنیا چھوڑ سکتی ہے' مگر اپنے بچوں سے دست بردار نہیں ہو سکتی' میری دھمکی کتنی اثر انگیز تھی' وہ میں نے فردوس کے چہرے پر دوڑتی زردی سے اندازہ لگا لیا۔
وہ صرف اک عورت ہی نہیں ماں بھی تھی' اور ماں کبھی بھی بچوں کو اپنے سے الگ نہیں کرتی۔

✡ ✡ ✡

نور کا موڈ صبح سے ہی خراب تھا۔ جب عطار سول نے' نوراں کو بلا کر پوچھا کہ اسے پڑھنا آتا ہے۔ اثبات میں جواب ملنے پر انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی حکیم فتح محمد سیوہانی کی کتاب "حیات النبی صلی اللہ علیہ و سلم" تھما کر' اسے دل لگا کر پڑھنے کو کہا۔
تب نور استہزائیہ بولی۔ "بابا سائیں! یہ ملاح زادی کیا جانے ان باتوں کو' اسے تو ڈراونوں پر کتاب دیجیے یا مچھلی مارنے کے آسان طریقے' جیسا کوئی کتابچہ۔" نور کے ہنس کے کہنے پر عطار سول نے نوراں کے چہرے پر لرزتے تاریک سائے کو تاسف سے دیکھا۔
"نوراں بھی ہماری طرح مسلمان ہے۔ اور ہر مسلمان کو آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی سیرت کی کتابیں پڑھنا چاہئیں' تاکہ انہیں اندازہ ہو کہ اسلام کے بنیادی عقائد اسے کیا پیغام دیتے ہیں۔ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے کتنی محنت کوشش اور تکلیفیں سہہ کر ہمیں اسلام کے زریں اصولوں سے روشناس کرایا۔" عطار سول

سانس لینے کو اک لمحے کے لیے رکے اور مسکرا کر کہا۔
"مجھے یقین ہے' نوراں نا صرف اسے پڑھے گی بلکہ یہ کتاب اس کی زندگی میں بہت تبدیلی لائے گی' کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں!" ان کے پر شفقت لہجے پر نوراں نے آنکھوں میں آئی نمی کو روکتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"ہاں' اللہ ہر مسلمان کو نبی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔" بی بی مریم نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔
نور کا چہرہ غصے اور خجالت سے تمتما اٹھا۔ نوراں کے جانے پر عطار سول نور کی طرف آئے۔
"دیکھو بیٹا! کسی کی ہنسی نہ اڑاؤ' اس سے احساس برتری پیدا ہوتا ہے' اور برتری ہلاکت میں مبتلا کرتی ہے۔ ایسی ہلاکت جو ابلیس کا مقدر ٹھہری ہے' اس لیے کہ سب سے پہلی ہنسی ابلیس نے اڑائی ہے آدم کی۔" عطار سول نرم لہجے میں اسے تنبیہہ کرکے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے باہر چلے گئے۔
نتیجتاً اس کا سارا دن غصے جھنجلاہٹ اور بوریت میں گزر گیا تھا' اسے رہ رہ کر قلق ہو رہا تھا کہ بابا سائیں نوراں کی وجہ سے اس پر ناراض ہوئے ہیں۔ بی بی مریم خاموشی سے اسے دیکھتیں اور پھر تسبیح پڑھنے میں مگن ہو جاتیں۔
تبھی جدائی کی خزاں پر ملن کی بہار' بچھڑے ہوؤں کا پتا لے کر آئی تھی۔
شاہ مراد ایک اجنبی کے ساتھ گھر میں داخل ہوا' بی بی مریم نے فوراً دوپٹے سے منہ ڈھانپا۔
"ارے یہ لڑکا باؤلا تو نہیں ہو گیا کہ اجنبی لڑکے کو لیے گھر میں گھسا چلا آرہا ہے۔" نور نے فوراً سے پیشتر تخت پر سے چھلانگ لگا کر اندر کی طرف دوڑ لگائی۔
شاہ مراد اس کا ہاتھ پکڑ کر دادی کے قریب آیا۔
"جیجی اماں! میں نے کہا تھا نا کہ پھپھو کو ڈھونڈ نکالوں گا' لے آیا ہوں ان کے بیٹے یعنی آپ کے نواسے کو۔" بی بی مریم کے ضعیف ہاتھ کانپے۔ تسبیح ان کے ہاتھ سے گر پڑی۔ لب لرزے۔
"یہ..... میری فردوس کا بیٹا ہے؟" انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما' اور بے ساختہ پیشانی کو چوما۔
"میری فردوس کہاں ہے؟" وہ زار و زار رونے لگیں۔
معراج نے ان کے ہاتھ پکڑ کر چومے اور ہچکولے

کھاتے وجود کو اپنے مضبوط بازوؤں میں لے لیا۔
"اماں جیجی! لے آؤں گا اماں کو بھی۔" وہ خود بھی رو پڑا۔ سب لوگ بے حد خوش تھے۔
"یہ چند دن سے یونیورسٹی نہیں آرہا تھا' فون کیا تو پتا چلا بیمار ہے' میں اور عامر اسے دیکھنے کے لیے اس کے گھر چلے گئے' وہاں ڈرائنگ روم میں دادا سائیں کی تصویر دیکھی' پوچھنے پر معراج نے بتایا کہ یہ اس کے نانا کی تصویر ہے۔ بس جیجی اماں! میرا دل تو خوشی سے ناچنے لگا۔"
معراج' شاہ مراد کے جوش و خروش سے بتانے پر مسکراتا رہا۔ "میں اور عامر اسے لے کر اپنے فلیٹ پر آئے' اور وہاں میں نے اسے سب کچھ بتا دیا' پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا' پھر یہ اٹھ کر چلا گیا' ڈیڑھ دو گھنٹے بعد بیگ سمیت پھر آگیا۔ ہم اسی وقت گاؤں کے لیے نکل گئے۔" شاہ مراد کے ساتھ ہی گھر کے دوسرے لوگ بھی معراج کی آمد سے بے حد خوش تھے اور یہ خوشی ان کے چہروں سے ہویدہ تھی۔

✡ ✡ ✡

آپ کا دل آپ کے خلاف گواہی دینے لگے' اور اپنا ضمیر ہی مجرم ٹھہرائے تو اپنی ذلت کتنی حقیر نظر آنے لگتی ہے' عبداللہ شاہ نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔
کال سچائی نے اس کی روح کو چھوا تھا' درد تو رگوں میں دوڑنا ہی تھا' کیسے نہ دوڑتا آخر کو حقیقت نے اپنے ہاتھوں سے اس کے دل کو تھاما تھا' دل جو کہ کتنا ہی نا سمجھ اور باغی ہو مگر کبھی نہ کبھی آپ کو کال حقیقت کی نگری میں لا پھینکتا ہے' جہاں سچائی اپنے اصلی وجود سمیت آپ کے آگے تن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ پھر اسے جھٹلانے کا کوئی راستہ نہیں ملتا سوائے اس کے کہ بے انصاف اپنی نا انصافی کی دوزخ میں خود ہی جلتا رہے' کیونکہ وہ بزعم خودی انا کی عفریتوں سے خود کو بچا نہ پایا تھا' تب وقت کے فیصلے کے آگے اسے صحرائے حیات میں بھٹکنا ہی پڑتا ہے۔ جہاں خلوص کی پیاس بڑھ کر تشنگی کی آخری حد کو چھوتی ہے' تو آپ کے سامنے صرف سراب ہی سراب باقی بچتا ہے' کوئی بھلا کب تک سراب سے خود کو بہلائے کہ ماضی کی مسرتیں حال کے غموں میں بدل گئی ہیں ـــــ مستقبل آپ کو ضمیر کا قیدی بنا ڈالنے کی تیاری میں مصروف ہو' تب صرف ہولناک سناٹے بچتے ہیں۔ جو آپ کے اندر بسنے کو ہمہ وقت تیار

ہوتے ہیں۔

موسم بہار کی اس اولین رات میں خود احتسابی سے گزرتے ہوئے اس نے اپنی زندگی کی خوشیوں کی بہار کو بے بسی سے روٹھتے دیکھا اس نے سر اٹھا کر آسماں کے چمکتے ستاروں کو دیکھا۔ جو وقت کی منصفی پر محظوظ ہو کر اس کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔

اکتیس سالہ ازدواجی زندگی میں لاتعداد جھوٹ اس نے اپنے نامۂ اعمال میں لکھوائے اور کتنے ہی فریب ٹانکے تھے' اب ماسوا شرمندگی اور پچھتاوے کے ازدواجی ترازو کے اس کے پلڑے میں کچھ بھی نہیں رہا تھا' جبکہ اس کی شریک حیات کے پلڑے میں اَن گنت وفاؤں کے خزانے رکھے تھے' اس نے اک لمحے کو رک کے اضطراب و بے چینی سے سگریٹ سلگایا اور پھر سے ٹہلنے لگا۔

"آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ اندر چلیں سردی ہے باہر۔" اس نے سر جھکا لیا۔ باوجود کوشش کے نظر اٹھا کر اسے نہ دیکھ سکا تھا' اک لمحہ اور اک نے اس کی دنیا ہی بدل دی تھی۔

"اندر چلیں نا! اس موسم میں یوں ٹہلنا مناسب نہیں' فلو ہو جائے گا۔" دھیمی اور نرم آواز نے اس کی سماعتوں میں رس گھولا۔

جب ظالم ظلم کرتا رہے۔ اور مظلوم برابر اس کا۔ وہی سے خیال رکھتا رہے' تو اک لمحہ ایسا بھی آتا ہے' جب ظالم کو اپنے وجود سے گھن آنے لگتی ہے' وہ بھی ایسی کیفیت سے گزر رہا تھا۔

"کیا آپ معراج کے گاؤں جانے سے پریشان ہیں؟" اس کے پاس' اس سوال کا کوئی جواب موجود نہیں تھا۔

"مجھے پتا ہوتا آپ اتنا پریشان ہو جائیں گے تو میں اسے کبھی بھی جانے نہ دیتی۔" اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی' آہ حویلی کی پلی عورت اتنے ظلم اور ناانصافی کے بعد بھی مجازی خدا کی تھوڑی پریشانی برداشت نہیں کر سکتی' اس کا جی چاہا وہ اس عمر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دے جب اس کی کنپٹی کے بال سفید ہو گئے تھے' اور اس کی بیوی کی مانگ بھی سفید بالوں سے جھلملانے لگی تھی۔

اس نے پشت پر سے اس کے شانوں پر شال پھیلائی تو اس نے دایاں ہاتھ اپنے بائیں شانے پر رکھے اس کے ہاتھ پر رکھ کر اسے ہاتھ ہٹانے سے روکا' اور اپنے اندر ہمت جمع کرتا رہا' حتیٰ کہ ایک قدم آگے آ کر اس کے برابر میں کھڑی ہو گئی' اس نے ایک بار پھر اپنے اندر کی توانائی کو مجتمع کیا۔

"میں نے۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا ہے۔" آواز کی نمایاں لرزش اور بے ربط جملوں نے اسے احساس دلایا کہ وہ اپنے اندر چاہنے کے باوجود زیادہ توانائی جمع نہیں کر سکا ہے' اس نے اپنے آپ کو کنویں کے بیچ لٹکتا ہوا محسوس کیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوری سچائی سے اعترافِ جرم کی ہمت و طاقت سے لبریز ہو کر کہا۔

"مجھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ ظلم کیا' اس رشتے کا مان توڑا' جس رشتے کی سب سے مضبوط اینٹ ہی "مان" ہوتا ہے۔" لمحے بھر کے توقف کے بعد خود کلامی کے انداز میں بولا۔

"مجھے۔ مجھے معاف کر دو۔" اس کے ہاتھ کو پکڑے وہ زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ "مجھے پتا ہے کہ یہ بھی تمہارے ساتھ اک اور زیادتی ہے کہ میں اپنی طویل زیادتی کی قلیل معافی مانگوں' مگر تمہاری بے ریا ۳۱ سالہ ازدواجی زندگی نے مجھے یہ حوصلہ بخشا ہے کہ میں تم سے درگزر کی درخواست کروں۔" وہ اپنا محاسبہ کرتے کرتے نڈھال ہو گیا تھا۔

... نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھا'.. مشرقی عورت اس کے معافی مانگنے پر نڈھال ہو کر شوہر کے سامنے زمین پر بیٹھ گئی۔

"کیا میں نے کبھی آپ سے کوئی شکوہ کیا ہے' میرے ساتھ جو کچھ ہوا' وہ میں نے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کیا' اور اب جبکہ ہم بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے ہیں' آپ کی یہ باتیں ہماری ہمسفری میں تھکاوٹ کے علاوہ اور کوئی اضافہ نہیں کریں گی۔" اس کی آواز میں تھکن ہی تھکن تھی۔ "میری وفاؤں کا صلہ اگر آپ کی ندامت میں ملا ہے' تو یہ صلہ میرے لیے بہت زیادہ ہے۔ مگر سائیں! اک بات یاد رکھیں کہ عورت کبھی بھی اپنے مرد کا سر جھکانا نہیں چاہتی' اس لیے کہ اس کا سب سے بڑا مان اس کا مرد ہوتا ہے اور اگر میرا یہ کہنا آپ کی تسکین کا ذریعہ بن سکتا ہے' تو میں اپنی اکتیس سالہ ازدواجی زندگی کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ میں نے آپ کو ہر وہ زیادتی معاف کی' جس نے آپ کو ضمیر کا مجرم بنا ڈالا ہے۔" وہ اندھے کنویں سے باہر آ گیا تھا۔

"سائیں عورت اگر مرد کو مسلسل معاف نہ کرتی رہے' تو پھر گھر نہیں بنتے۔" چند آنسو اس کے رخساروں کو پھلانگ کر زمین پر گرے تھے' اس کا سارا کرب ان آنسوؤں میں پوشیدہ تھا۔

اور زندگی میں پہلی بار عبداللہ شاہ کے آنسوؤں نے اس کے آنسوؤں سے مل کر درد بانٹا تھا۔

٭ ٭ ٭

پھر اک بھونچال تھا جو اس گھر میں آ گیا' میں جو اکیس سالوں سے اپنے انتقام سے محظوظ ہو رہا تھا' اس ایک صرف ایک رات میں میرے انتقام کا بت پاش پاش ہو گیا۔ اور یہ بت شکن میرا اپنا خون' جگر کا ٹکڑا معراج بنا۔ جسے میں نے کاندھوں پر اٹھا کر پالا' گود میں بٹھا کر کھلایا۔

"دادا سائیں! گزشتہ برسوں میں ایک بار بھی اس کے صبر سے آپ کو ڈر نہیں لگا۔ کیوں اتنے بے خوف ہو گئے تھے آپ؟" اس کے سفید چہرے پر غصے کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔ "ایسی کون سی طاقت آ گئی تھی آپ کے ہاتھ کہ خوفِ خدا سے بھی عاری ہو گئے۔" دھیمے لہجے میں بات کرنے والے معراج کے لہجے کی تیزی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

"انتقام کی طاقت۔ انتقام کوئی طاقت نہیں ہوتی۔ یہ تو بزدلوں کا ہتھیار ہے' جو صرف کمزوروں پر استعمال ہوتا ہے' کتنے بھولے ہیں آپ اور۔ اور کتنے بزدل۔" اس کے تمسخر سے کہنے پر میں تڑپ کر مصلّے سے اٹھا۔ مغرب کے بعد پڑھے جانے والا وظیفہ میرا بیچ میں ہی رہ گیا۔

"معراج! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اسے چند دنوں سے بخار تھا' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"طبیعت تو میری اب خراب ہوئی ہے آپ کے عظیم کارنامے سن کر۔" اس نے ماتھے پر رکھے میرے ہاتھ کو جھٹک کر توہین آمیز لہجے میں کہا۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ "کیا یہ سب کچھ جان گیا ہے؟" سب سے پہلا سوال میرے ذہن میں یہی ابھرا۔

"معراج! تم بیٹھو بیٹا!" میری آواز مجھے ہی اجنبی محسوس ہوئی۔ اس کا مضبوط وجود دیکھ کر اس وقت مجھے فردوس کی حقیقی طاقت کا اندازہ ہوا تھا۔

"مخلوق پر ظلم کے ساتھ خالق کی عبادت آپ کو بخشش کی سند عطا نہیں کر سکتی۔" اس نے میرے بائیں ہاتھ میں لٹکتی ہوئی تسبیح کی نچلی سطح کو اپنی مٹھی میں بھینچ کر کہا۔

"کیا ہوا معراج! کیوں چلا رہے ہو؟" فردوس نے اندر داخل ہوتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بند کر دو یہ ڈرامہ کیا سمجھتے ہو تم لوگ' میں نے ظلم کیا ہے' ارے جو کچھ بھی کیا۔ تم لوگوں کی بھلائی کے لیے ہی کیا۔"

"میری ماں کی میکے سے دوری میں ایسی کیا بھلائی پوشیدہ تھی کہ ہمیں پتہ تک نہیں کہ ہمارا کوئی ننھیال بھی ہے۔" معراج چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو مجھے اور غصہ آ گیا۔

"ارے بے وقوفو! تمہیں کیا پتا کہ لوگوں کی ہمارے ساتھ عقیدت و ارادت میں کیا لطف ہے' اگر میں گدی نشین بن جاتا تو پھر یک عبداللہ کے حصے میں آتی' ہزاروں لوگ تم لوگوں کے آگے پیچھے پھرتے جوتیاں اٹھاتے تمہاری' مگر بھاجائی مریم نے کچھ نہ سوچا' بس بیٹے کے لیے بیٹی بھی داؤ پر لگا دی' کیا فرق پڑتا تھا اگر آئندہ نسل میں پوتے نہیں اس کے نواسے گدی کے وارث بنتے۔"

"ہاں پھر اسی گدی نشین پر میں اور ماجد لڑتے ہمارے جھگڑوں میں دو چار مرید جان سے جاتے' اور یہ دشمنی ہماری آنے والی نسلوں تک منتقل ہو جاتی۔ کیوں ٹھیک کہا نا دادا سائیں! کیا اچھی پلاننگ کی تھی آپ نے' ہمارے لیے۔" معراج کے طنزیہ کہنے پر مجھے اور طیش آیا۔

"دیکھ رہے ہو عبداللہ! تم اپنے بیٹے کی زبان درازی' ارے کبھی تمہاری آواز میری آواز سے اونچی نہیں ہوئی۔"

"ہاں' اس لیے کہ میں معراج ہوں انہوں نے آپ کے ظلم میں آپ کا ساتھ دیا اور بیوی پر ظلم خاموش تماشائی کی طرح دیکھتے رہے' مگر میں اپنی ماں پر نہ تو ظلم کر سکتا ہوں اور نہ کسی کو کرنے کی اجازت دوں گا۔ میں شاہ گوٹھ جا رہا ہوں' آپ حسبِ سابق اور حسبِ معمول کہیں چھپ سکتے ہیں' تو میرے آنے سے پہلے ہی سب کو لے کر کہیں اور منتقل ہو جائیے گا۔ مگر یاد رکھیے گا۔ اس بار آپ لوگ نہیں' آپ کا معراج گم ہو جائے گا۔" وہ طنز سے مسکراتا ہوا تیزی سے باہر نکلا تھا۔

٭ ٭ ٭

بی بی مریم کے پاس گاؤں کی عورتیں مبارک دینے آ رہی تھیں کہ ان کی بیٹی کا پتہ چل گیا اور ان کا نواسہ گاؤں میں موجود تھا۔ یہ خبر آناً فاناً سارے گاؤں میں پھیل گئی' وہ خوشی خوشی لوگوں سے مبارک باد وصولتی رہیں۔ خوشی کا

موقع تھا' اندر باہر لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

وہ بڑی دلچسپی اور حیرت سے یہ مناظر دیکھتا رہا' کچھ دیر پہلے ہی وہ اوطاق سے اٹھ کر اندر حویلی میں آیا تھا' مگر ادھر بھی ویسی ہی گہما گہمی تھی۔

"مامی! کیا صبح نہیں ہو گی؟" وہ آتی جاتی عورتوں کو دیکھ کر مسکرایا۔

"ارے پگلے! یہ گاؤں ہے' یہاں کے لوگ بڑی محبت والے ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بات پر یونہی دوڑ کر آتے ہیں' اور آج تو اتنی بڑی خوشخبری ملی ہے سب کو' وہ صبح ہونے کا انتظار نہیں کریں گے۔" انہوں نے ہنس کر اسے بتایا' اور مٹھائی کے ڈبے ساس کے سامنے جا کر رکھے جو بڑے اشتیاق سے مٹھائی آنے والی عورتوں میں تقسیم کر رہی تھیں۔

ان بیتے سالوں میں کیا کچھ نہیں کھویا ہم نے' محبت شفقت' خلوص۔" اک ٹیس سی اٹھی تھی اس کے وجود میں۔ وہ تھک چکا تھا اور سونا چاہتا تھا' اس لیے برآمدے میں چارپائی پر بچھے اپنے بستر پر لیٹ گیا' کروٹ بدل کر بی بی مریم کو دیکھا' جو تخت پر عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ باوجود تھکن کے اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اچانک اسے گھٹن کا احساس ہوا تھا۔ چارپائی سے نیچے اترا' پائنتی کی طرف سے پکڑ کر اسے صحن میں گھسیٹا۔

"سائیں..... سائیں! چھوڑیں میں نکالتی ہوں باہر۔" ایک عورت نے سرعت سے بستر لپیٹ کر اپنے کاندھے پر رکھا' دوسری نے چارپائی کو کھڑا کر کے اپنے پیٹھ پر لادا' اور جا کر صحن میں بچھا دی' وہ حیرت سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

شاہ مراد نے اس کی حیرت سے محظوظ ہو کر قہقہہ لگایا تو وہ اچھا خاصا کھسیانا ہو گیا۔

"یار واقعی گاؤں کی عورتیں تو کافی محنتی ہوتی ہیں۔" اس نے ہنس کر داد دی۔

☆ ☆ ☆

میری پلاننگ یہ تھی کہ جب سارے بچے اپنی عملی زندگی میں قدم رکھیں گے تو میں ان کو سب کچھ بتا دوں گا' انہیں اس بات کا احساس دلاؤں گا کہ تمہارے ساتھ کتنی زیادتی ہوئی ہے کہ ہمیں اپنا گاؤں' درگاہ' زمینیں سب کچھ چھوڑ کر پردیس میں آباد ہونا پڑا۔ مگر میرے بتانے سے پہلے ہی معراج کو سارے قصے کی خبر ہو گئی' اپنے ماموں زاد کی زبانی جو کہ اس کے ساتھ پڑھتا تھا۔ میں انتقام کا آخری مرحلہ ہار گیا۔ اس لیے کہ مقابل میرا جانِ جگر معراج تھا۔ اس کے الفاظ بار بار میرے ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیتے۔

اس نے دھمکی دی تھی کہ اس بار آپ کا معراج گم ہو جائے گا' اسے تیسرا دن تھا مجھ سے جدا ہوئے' تب مجھے لگا کہ میں گزشتہ اکتیس سالوں کا حساب تین دنوں میں دے چکا۔

بعد از عشاء ابھی میں مصلے پر ہی بیٹھا تھا کہ باہر مجھے غیر معمولی شور کا احساس ہوا۔ بھاجائی مریم کی آواز میں پہچان گیا تھا۔ لاؤنج سے ساری آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ سب اکٹھے تھے۔ خوش تھے' اور میں جو ابھی ابھی اشک ندامت بہا کر بیٹھا تھا' بالکل تنہا رہ گیا تھا' اس سپہ سالار کی مانند جس کی فوج باغی ہو کر دشمن کے مورچوں میں جا بیٹھے اور مجبور ہو کر اپنے ہتھیار سپرد دشمن کر دیے۔ اس وقت مجھے اپنی شریکِ حیات بہت یاد آئی۔

"چاچا! چاچا سائیں! کہاں ہیں؟" یہ آواز یقیناً عطا رسول کی تھی۔

چلو دیر ہی سے سہی کسی کو تو میرا خیال آیا مجھے ڈھارس ہوئی' اسی وقت عطا رسول کمرے میں داخل ہوا۔

"چاچا سائیں! ہم سے جو بھی غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئی ہوں' میں ان کی معافی مانگتا ہوں' میں اپنی نیانی (بیٹی) لے کر آیا ہوں آپ کے پاس۔"

جو پلو گلے میں ڈالے (آپ کے) آنگن میں بخشوانے آئیں۔ انہیں دیکھتے ہی ان کی خطائیں منہ میں نہیں دینی چاہئیں' ان کی خطاؤں غلطیوں کی پردہ پوشی کرنی چاہیے' چاہے لاکھوں غلطیاں ہوں تب معافی دے کر درگزر سے کام لینا چاہیے۔ شاہ لطیف کا بیت پڑھ کر' اس نے آناً فاناً اپنی پگڑی اتار کر میرے پاؤں پر رکھنا چاہی' میں نے پگڑی اپنے پاؤں پر پہنچنے سے پہلے ہی اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی' اور گھبرا کر مصلے پر سے کھڑا ہو گیا۔

"کیا..... کیا کرتا ہے عطا رسول شاہ! ارے بابا سات پیڑھیوں کی پگ ہے تیرے سر پہ۔ اس کی یوں تو بے حرمتی نہ کر۔" میں نے پگڑی اس کے سر پر رکھی' ادا کی کتنی شباہت تھی اس میں' وہ میرے ہاتھ چوم رہا تھا' میں بے ساختہ اس کی پیشانی چومنے لگا۔

"ارے پگلے! نیانی کے آتے تو سات خون بخش دیے جاتے ہیں' تو نے کون سا ایسا گناہ کیا ہے' تمہاری نیانی میری نیانی ہے' آئی ہے تو بھلی کرے آئی' میرے آنکھوں پر' میری اماں ہے' بھتیجی ہے' پر ابا عطا رسول! تو میرا مجرم نہیں ہے کہ نیانی کا میڑ (واسطہ) لایا ہے' جو وقتی غصہ تھا بابا وہ تو کب کا ختم ہو چکا' پھر تو انا تھی جو ہمیں ملنے میں آڑے آتی رہی۔ بھاجائی مریم! اماں فردوس! مجھے تم دونوں معاف کر دو' بڑا دل رنجایا ہے' میں نے تم لوگوں کا۔" لاؤنج میں آ کر میں نے معافی مانگی۔

"بس چاچا! جو ہو گیا' سو درگزر۔" ان کے بولنے سے پہلے عطا رسول بول اٹھا۔

معراج نے آ کر میرے گلے میں بانہیں ڈالیں۔ اور اب مجھے اپنے مکافاتِ عمل کے ختم ہونے کا انتظار ہے' جب عطا اللہ اکیس سالہ جدائی ختم کر کے امریکہ سے ہمیشہ کے لیے لوٹ آئے' مجھے یقین ہے اب اس کا فون نہیں وہ خود آئے گا۔ کچھ ہی عرصے بعد عطا رسول نے مجھ سے مراد اور ماہین کے رشتے کی بات کی۔

کیا وہ ہم سے بدلہ لیں گے؟ مجھے وہم ہوا' مگر اس وہم سے جلد ہی میں نے پیچھا چھڑا لیا۔ مجھے یقین تھا کہ ماہین دونوں خاندانوں کے ملاپ میں پل کا کردار بخوبی نبھائے گی' عطا رسول کبھی بھی بہن سے بدلہ نہیں لے گا' کیونکہ فردوس پہلے ہی بہت دکھی تھی' وہ بہن کو دکھ کسی صورت میں بھی نہیں دے سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

جوں جوں شاہ مراد کی شادی کا دن قریب آ رہا تھا۔ لوگوں کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا' سید عطا رسول شاہ کے اکلوتے بیٹے کی شادی تھی۔ جس کو شاندار طریقے سے منعقد کرنے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔

اس رات گیت گانے کے بعد وہ لوگ کچہری کرنے لگیں۔ سب نے اپنے اپنے طور پر قصے سنائے پھر نور نے نوراں کی طرف دیکھا۔

"میں' میں کیا سناؤں۔" اس نے گھبرا کر نور کو دیکھا' جو نجو کے منہ کے طنزیہ زاویوں سے محظوظ ہو رہی تھی۔

"اسے کیا آتا ہے' یہ کیا سنائے گی۔" نوری بی کے طنز پہ وہ خاموشی سے بیٹھی رہ گئی۔ کسی نے بھی نوری بی کو کچھ نہ کہا' بلکہ نجو اور بھابی کی ہنسی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ اس نے دیکھا صرف بھیجی کنوار نے خاموشی سے نور کو تیز نظروں سے گھورا تھا۔

پچھلے ایک سال کے مطالعے کے بعد وہ بہت پُر اعتماد ہو گئی تھی۔ جس کی حویلی آتے جان جاتی تھی' بہت دلجمعی سے حویلی آنے لگی تھی' ماں کا ہاتھ بٹا کر سیدھی بابا سائیں کے مکتب میں گھس جاتی' وہاں کتابوں کو صاف کرتی' انہیں ترتیب وار رکھتی' اور جو کتاب بھی پڑھنے کو جی چاہتا وہ بابا سائیں کی اجازت سے گھر لے آتی۔

ایسے میں کبھی جو بابا سائیں اپنی رائیٹنگ ٹیبل پر بیٹھے ہوتے تو کچھ پڑھتے ہوئے اسے بھی سنانے سمجھانے لگتے' تب اسے اپنا آپ بڑا معتبر لگتا اور کبھی جو وہ یہی باتیں اپنے باپ کو سناتی تو وہ خوش ہو کر کہتا۔

"ارے! میری بچی تو بہت سیانی ہو گئی ہے۔ پر یہ سب بابا سائیں کی فیض نظر ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلا کر مسکرا دیتی۔

"پھر بھیجی کنوار کے اصرار پہ وہ ایک گہری سانس بھرتے ہوئے بولی۔

"بھیجی! اک بار کوئی نیک نمازی ملاح کشتی میں بیٹھا تھا۔ اک سید اپنے کتوں اور مرغوں سمیت اس کشتی میں سوار ہوا تو وہ ملاح ہنسنے لگا۔ سید نے کہا۔ تمہیں شرم نہیں آتی کہ مجھ پر ہنستے ہو۔ ملاح بولا۔ سائیں آپ پر نہیں ہنستا' ہنسی تو مجھے اس بات پر آ رہی ہے کہ جو آپ کے آباؤ اجداد کا طریقہ تھا' وہ میں نے اپنایا ہوا ہے اور جو میرے بڑوں کی "رسم طریقہ" تھی وہ آپ نے اپنائی ہوئی ہے' کہ کتوں' ریچھ اور مرغوں کی آپس میں لڑائی کرواتے ہیں۔"

"یہ بات بتانے سے تمہارا کیا مقصد ہے؟" اس نے حیرت سے نور کے غصے سے لال پڑتے چہرے کو دیکھا۔

"تمہاری اس بات سے ملاح اور سید برابر ہو گئے کیا؟ سمجھتی کیا ہو تم اپنے آپ کو؟" اس کی آواز اچھی خاصی تیز تھی۔ بھیجی اماں نے استغفار اور بھیجی کنوار نے بھی تاسف کیا تھا۔

تو کیا سچ کہنے کا اختیار بھی صرف سادات کو ہے؟ اس کے اندر تلخ سوچ نے سر ابھارا۔

"نور کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" بھیجی کنوار نے اسے تنبیہہ کی۔

"اماں! آپ نے اسے سر چڑھایا ہوا ہے۔"

"مگر میں نے ایک مثالی بات ہی تو کی ہے۔" اس کی سالوں کی چپ ٹوٹی۔

"یہی تو پوچھ رہی ہوں' یہ بات بتا کر کیا ثابت کرنا چاہتی

ہو؟"

"نہیں یہ تمہاری تھی کہ صرف حسب نسب ہی سب کچھ نہیں۔ تقویٰ بھی کوئی چیز ہے۔"

"ہنہ، کچھ بھی کرلو تم لوگ مگر کبھی بھی ہماری برابری نہیں کرسکتے۔"

"ہم آپ کی برابری کرنا بھی کب چاہتے ہیں؟" پہلی مرتبہ اس کے لہجے میں تلخی در آئی۔ مٹی بناتی امیراں نے سوٹی کورلی میں اٹکایا، تیزی سے اٹھ کر اس کی طرف آئی۔

"چپ کر نوراں! باجی سے زبان مت چلا۔"

"تمہارے بس میں برابری کرنا ہو تو کرو نا! دراوڑوں کی اولاد!" نور چیخی۔

"توبہ توبہ مائی کیا دور آگیا ہے، گھر کے نوکر بھی اب مالکوں کے منہ آنے لگے۔" پھاپی نے زور و شور سے اپنی ناک کے اوپر انگلی گھمائی۔

امیراں نے بے بسی سے پھاپی کو دیکھا اور نور کے پاؤں پر ہاتھ رکھے۔

"نہیں چھوٹی جیجی! ہم کیسے آپ کی برابری کرسکتے ہیں، ہم تو آپ کے باندیوں بندھے غلام ہیں۔"

دلیل سننے، سمجھنے اور ماننے کا حوصلہ نہ ہو تو وہاں ہر جامع دلیل بھی بیکار ہے۔ اس نے معافی مانگتی ہوئی اپنی ماں کو دیکھ کر سوچا۔

"نہیں۔ نہیں دلیل ہی بہت بڑی طاقت ہے۔" اس کا شعور انگڑائی لے کر بیدار ہوا۔

نہیں..... نہیں۔

دلیل ہار جاتی ہے۔ طبقاتی فرق کے آگے، چاہے سچی اور عمیق کیوں نہ ہو۔ اس کے اندر کہیں انا نے سر پٹکا۔

"کیا شور مچایا ہوا ہے؟" شاہ مراد کی آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ کتنی ہی دیر سے اپنے اندر کے شور پر باہر کی آوازوں سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

"باہر تک آواز آرہی ہے، کس کس نے نہیں سنی ہوگی۔ سناٹے میں تمہاری آواز۔" اس نے نور کو ڈانٹا۔

"اٹھ چل گھر۔" امیراں تیز لہجے میں بولی۔ وہ کراہتی انا کو بمشکل گھسیٹ کر گھر پہنچی۔

"میں نہ کہتی تھی کہ مت پڑھنے دے اسے کتابیں، ارے ہم غریب ملاح ہمارا کیا جائے ان کتابوں میں نوراں کے ابا! آج کروا دی ناں اس نے بیستی (بے عزتی۔)" وہ خالی نظروں سے باپ کے سامنے دکھڑا روتی ماں کو دیکھنے لگی۔

"ارے غریب کو علم راس نہیں آتا۔" امیراں رونے لگی، اس کا باپ چل کر اس کے سامنے بڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ دوسری چارپائی پر پیر سمیٹ کر بیٹھی باپ کو خاموشی سے تکتی رہی۔

"میں سمجھا تھا کہ تو سیانی ہوگئی ہے، پر تیرے علم نے تو تجھے مرشدوں کے سامنے کھڑا کردیا۔ چار اکھر (حرف) کیا پڑھ لیے تو نے کہ اپنے آپ کو ان کے برابر سمجھنے لگی ہے۔" وہ اداسی سے باپ کو تکنے لگی۔ "جو علم ہماری بیستی کروا دے، اس علم سے تو بے علم چنگی ہے۔" غلامو نے دھیمے لہجے میں دکھ سے کہا۔ اس نے محسوس کیا اس کے اندر کوئی جوار بھاٹا اٹھ رہا ہے۔

"اسے اچھی طرح سمجھا دے اپنی اوقات۔" امیراں نے غصے سے چیخ کر شوہر کو کہا۔ اس نے ساٹھ واٹ کے بلب کی زرد روشنی میں اپنے باپ کو کاندھے سے کپڑا اتار کر پیشانی سے پسینہ پونچھتے دیکھا۔

"دیکھو نوراں! باجیوں سے بحث مت کیا کر، اللہ نے ان کو اہل بیت کے شرف سے نوازا ہے، اور ہم تو ان کے در کے خادموں کے بھی خادم ہیں، ہماری کیا مجال کہ ان کے سامنے زبان کھول سکیں، دیکھ تو سدھر جا۔"

"یہی۔ یہی تو میں بھی کہتی ہوں بابا!" اس کے اندر کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ "اس کی مرضی۔" انگلی آسمان کی طرف اٹھائی۔ "اس کی مرضی جس کو جہاں چاہا، جب چاہا، جس دور میں چاہا، جیسے چاہا بھیج دیا، اس نے میری مرضی سے تو مجھے ملاحوں میں نہیں بھیجا، وہ کسی سے نہیں پوچھتا ہے، وہ... وہ منصف ہے۔" آنسو بڑی روانی سے اس کے گالوں پر پھیل رہے تھے۔ "ہاں..... ہاں وہ منصف ہے، تبھی... تبھی تو تقرب الٰہی کا پیمانہ ذات پات نہیں تقویٰ رکھ دیا۔" اس کی ہچکی بندھ چکی تھی۔ "وہ عادل ہے۔ جانتا ہے، کامل سچائی، کامل حقیقت، تبھی تو پیر و سید، ملاح و ماچھی کو ایک ہی کسوٹی پر پرکھتا ہے، ایک ہی ترازو میں تولتا ہے، یہ اس کا کامل عدل ہے اور کامل انصاف۔" وہ رو رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔ اس کے اندر سالوں کا پکتا ہوا لاوا پوری شدتوں سے بہہ نکلا تھا۔ غلامو نے اپنا آپ اس لاوے میں جلتا محسوس کیا تھا۔ اس کی بیٹی کس گہرے بھید تک رسائی پا گئی تھی۔ وہ تڑپ کر اٹھا، نوراں کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

"نہ رو' میری اماں! میری دھی۔" وہ اس کی پیشانی چومنے لگا۔ "تو تو تجی میں بڑی سیانی ہو گئی ہے۔"

"میں اب حویلی نہیں جاؤں گی۔"

"ہاں مت جانا میں تمہیں نہیں کہوں گا۔" پھر وہ واقعی اپنی بات پر قائم رہی' بھیجی کنوار کے پوچھنے پر' امیراں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ شادی والا گھر ہے' نور بی بی اور اس کی آپس میں بنتی نہیں' کہیں پھر بدمزگی نہ ہو جائے' اس لیے اسے لے کر ہی نہیں آئی پھر وہ شاہ مراد کی شادی میں بھی حویلی نہیں آئی۔

✡ ✡ ✡

"کیا بات ہے' میری کتابوں پر ڈھیروں گرد جمی ہے۔ اور بہت دنوں سے نوراں بھی نظر نہیں آئی۔" عطار سول' شادی کی مصروفیتوں سے فارغ ہوئے تو اپنی لائبریری کی یاد آئی۔

"میں روز صفائی کرواتی تو تھی۔ مگر نجو کو آپ کی کتابوں کو چھیڑنے سے منع کر دیتی تھی' وہ ترتیب بگاڑ دیتی۔ تو آپ ناراض ہوتے' اور شادی کی مصروفیت اور کاموں میں مجھے اتنی فرصت نہیں ملی کہ خود جا کر صفائی کر دیتی' ویسے اب تو عادت بھی نکل گئی ہے۔ نوراں ہی دیکھتی ہے۔" بی بی کنوار نے دھلے ہوئے بستروں کو تہہ کرتے ہوئے مفصل جواب دیا۔

"تو کیا نوراب نہیں آئی؟"

"نہیں سائیں! اس کی نور کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی۔"

"لڑائی ہو گئی' کیوں؟ اتنے ٹھنڈے مزاج کی لڑکی ہے وہ....."

جواباً بی بی کنوار نے تفصیلاً ساری بات بتادی۔

"یہ سید اور ملاح والی بات میں نے ہی اسے بتائی تھی۔ نور کے بگڑنے کی کیا بات تھی اس میں؟ اچھا ایسا کرو' نوراں کو کہلوا بھیجو کہ تمہیں بابا سائیں بلا رہا ہے۔" وہ جلدی سے ہدایات دے کر پھر لائبریری میں چلے گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ عطار سول شاہ کے سامنے تھی' وہ اسے دیکھ کر شفقت سے مسکرائے۔

"ناراض صرف نور کے ساتھ تھی۔ یا ہم سب کے ساتھ کہ آنا ہی موقوف کر دیا؟"

"بابا سائیں! غریب اور غلام بھی کبھی کسی سے ناراض ہوتے ہیں کیا۔ بس چھوٹی بیبی' مجھے دیکھ کر غصہ نہ ہو جائے' اس وجہ سے نہیں آرہی تھی۔" وہ شرمندگی سے بولی۔

"غلامو صحیح کہتا ہے۔ تو تو واقعی بڑی سیانی ہو گئی ہے۔" وہ ہنس کر بولے تو وہ سر جھکا کر مسکرا دی۔

"آج تم مجھ سے جو بھی سوال کرو گی' جواب دوں گا' باہر مہمان بھی نہیں ہیں' اس لیے میں ہر کام سے فارغ ہوں۔ ظہر تک' اس کے بعد میں نماز پڑھنے جاؤں گا' اور تم صفائی میں لگ جانا۔" عطار سول نے اسے مکمل پروگرام بتایا۔

"بابا سائیں! میرے کسی سوال پر ناراض تو نہیں ہو جائیں گے آپ؟"

"نہیں نہیں' بالکل بھی نہیں۔" وہ زیر لب مسکرا کر خوش دلی سے بولے۔

وہ نیچے چوکی پر بیٹھی ہوئی تھی' سامنے ہی کرسی پر عطا رسول شاہ بیٹھے ہوئے تھے' اس کی نگاہ بار بار دروازے میں سے بھٹک کر صحن میں رلیاں دھوتی اپنی ماں پر جا پڑتی۔

"بابا سائیں!" وہ چند لحظے جھجک کر رکی۔ "اللہ سائیں کسی کو بھی اس کی مرضی سے تو دنیا میں نہیں بھیجتا تو پھر دولت' عزت' نسب پر نازاں ہونا' حالانکہ بندہ خود تو بے بس ہے بابا سائیں..... مجھے..... کچھ وضاحت کریں۔" وہ لجاجت سے گویا ہوئی۔ وہ زیر لب مسکرائے۔

"اختیار سب اللہ کا ہے' کسی کی مجال نہیں کہ اس کے کاموں میں دخل دے' اسی طرح وہ ہر ایک کو اپنی مرضی سے بھیجتا ہے۔ وہ اگر لوگوں سے پوچھ کر انہیں بھیجتا تو کوئی غریب نہ ہوتا۔ ہر کوئی اعلیٰ اور خاندانی ہونا پسند کرتا۔ اپنے لیے تو ہر کوئی مکمل آسائشیں چاہتا ہے نا؟ پھر یہ معاشرتی' طبقاتی' سماجی تفریق و تضاد بھی نہ ہوتے' مگر وہ بندوں کو آزماتا ہے۔ غریب کے لیے غربت بھی آزمائش' امیر کے لیے امارات و دولت بھی آزمائش' وہ بندوں کو بندوں کے ذریعے آزماتا ہے۔ کسی کو نابینا کر دیا کہ بینا اس کا کتنا شکر ادا کرتے ہیں۔ کسی کو بیمار کیا کہ صحت منداس کا کتنا شکر ادا کرتے ہیں۔ معذور کے لیے معذوری و محتاجی آزمائش (صبر) اور مکمل چاق و چوبند کے لیے مکمل جسم آزمائش (شکر) وہ ہر دو صورتوں میں آزماتا ہے' مصیبت کے ذریعے بھی' نعمت کے ذریعے بھی' نعمت دے کر بھی اور چھین کر بھی۔ مگر ہم ناقص العقل ان مصیبتوں اور آزمائش کو بار گراں' آفت ناگہانی اور نعمتوں کو اپنا پیدائشی حق سمجھ کر اس آزمائش و امتحان سے بے بہرور رہتے ہیں۔" عطار سول کا دھیمے لہجے میں اس کی ذہنی گتھیاں سلجھانا' اسے اپنی ہی نظروں میں کتنا معتبر بنا رہا تھا۔ "اور یوں' بندے اس آزمائش و امتحان میں فیل ہو کر' آخرت کی رسوائی اپنے لیے چن لیتے ہیں۔ اس نے اک گہری سانس بھری' یاد رہے' ہماری دنیاوی زندگی ایک امتحان ہے۔ جو اس امتحان میں پاس ہو گیا' اس کے لیے بطور انعام ابدی زندگی میں اپنے اصلی وطن جنت میں محل و آسائشیں ہیں۔"

"سائیں! کوئی ایک خامی بتائیں' جس کی وجہ سے بندہ امتحان میں فیل ہو جاتا ہے۔"

"شکوہ کثیر' شکر قلیل۔"

"بابا سائیں! کوئی ایک خوبی جس کے سبب بندہ پاس ہو جائے۔"

"بہت ہی آسان' قلیل کو شکوہ کے کثیر کو شکر کے آگے لگا دو۔" کمرے میں موجود تینوں نفوس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ نوراں اٹھ کر بی بی کنوار کے ساتھ کتابیں صاف کروانے میں مدد کرنے لگی۔

"جب بندہ اللہ کی ہر نعمت کا شکر ادا کرے گا' اور شکوہ قلیل ہو گا تو وہ رب اس کے اندر عاجزی و قناعت پیدا کرے گا' اور جب یہ دونوں چیزیں بندے کے اندر آجائیں گی' تو شکوہ جو قلیل ہو گا' وہ بھی جاتا رہے گا۔ اس کی زندگی شکر' عاجزی و قناعت کا نمونہ بن جائے گی۔"

"بابا سائیں! دروازے پر غلامو کھڑا ہے' باہر مہمان آئے ہیں' آپ کو بلا رہے ہیں۔" عطار سول' نجو کی اطلاع پر اٹھے' ٹوپی اٹھا کر سینٹر ٹیبل سے تسبیح اٹھا کر جیب میں ڈالی اور باہر کو چل دیے۔

اس دن نوراں کو اپنی ذات کا عرفان حاصل ہوا تھا' اس کے ذہن کی بند کھڑکیاں کھل گئی تھیں۔

"زندگی کتنی پیاری چیز ہے' حسد اور نفرت میں کیوں گزاری جائے۔" نجو کی نفرت آمیز نگاہ پر وہ سوچ کر مسکرائی۔ "بندگی کا حق ادا کر دو' تو ذات پات نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔" وہ تیزی سے کتابیں صاف کر کے شیلف میں رکھنے لگی۔

✡ ✡ ✡

نور نے ڈیوڑھی سے اندر آتی ہوئی صورتوں کو دیکھ کر ناک سکیڑی۔

"کیا ہے لوگوں نے جیسے قسم کھائی ہوئی ہے کہ حویلی میں ضرور حاضری دینا ہے۔" اس کے نخوت سے کہنے پر نجو نے ہنسنا اپنا فرض جانا' عورتیں اب اس کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ اب اس سے مل کر اس کے ہاتھ چوم رہی تھیں۔ متکبر تو وہ پہلے ہی تھی' اوپر سے لوگوں کی اس قدر تعظیم اس کے غرور میں اور اضافہ کرتی۔

"کیسی ہو بیبی؟" ایک عورت نے بڑی محبت و عقیدت سے پوچھا۔

"ظاہر ہے ٹھیک ہوں۔" جواب رکھائی سے دے کر وہ منہ پھیر کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ بی بی مریم نے متکبر پوتی کو بڑی غور سے دیکھا اور آنے والی عورتوں سے بڑی محبت سے مل کر حال احوال پوچھنے لگیں۔

"بیبی پھپھو! ذرا اسے سنبھالیے میں اور ماہین لنگر کا انتظام دیکھیں۔" بی بی کنوار نے شاہ مراد کا بیٹا اسے تھمایا۔ انہوں نے بسم اللہ کہہ کر چند ماہ کا بچہ گود میں لیا۔

"بیبی اماں! نام کیا رکھا ہے؟"

"بڑے سائیں کا نام رکھا ہے سید عبدالعلی شاہ۔" انہوں نے عقیدت مند کو جواب دیا۔

"یہ نام شاہ مراد کیوں نہیں رکھا؟" دوسری عقیدت مند نے پوچھا۔

"شاہ مراد بڑے سائیں کے دادا تھے' بڑے سائیں کو ایک بیٹا ہوا تو اس پر باپ کا نام رکھ دیا۔ اور پھر جب عطا رسول کو بیٹا ہوا تو اس نے پہلے پردادا کا نام رکھا۔ کہا دوسرا بیٹا ہو گا تو اس پر باپ کا نام رکھوں گا مگر شاہ مراد کے بعد نور پیدا ہوئی۔ بس یہ دو ہی اولادیں اس کی قسمت میں لکھی ہوئی تھیں۔" بی بی مریم تفصیلاً عورتوں کی معلومات میں اضافہ کر رہی تھی' ساری حویلی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ برآمدے سے کرسیاں اور چارپائیاں نکال کر عورتوں کے بیٹھنے کے لیے نیچے قالین بچھا دیے گئے تھے' ایک بی بی مریم کا تخت دوسرا جھولا اپنی جگہ پر موجود تھے۔

پرانی طرز تعمیر کی یہ حویلی روشنیوں سے سجی ہوئی تھی۔

"اماں کنوار! برادری کا کھانا خیال سے بھیجنا' دیکھنا کوئی گھر رہ نہ جائے۔" بی بی مریم نے بہو کو ہدایت دی' نور تھوڑی دیر ان عورتوں سے باتیں کرتی رہی جو اس کے کمرے میں بیٹھی تھیں' پھر اکتا کر باہر نکل آئی' لمبا برآمدہ وسیع صحن عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔

"حیرت ہے بھابھی کراچی کی پڑھی لکھی ہو کر ان جاہل

عورتوں سے کیسے ہنس ہنس کر باتیں کرلیتی ہیں، مجھے تو اتنی الجھن ہوتی ہے۔" لوگوں کو خیال سے کھانا کھلاتی ماہین کو دیکھ کر اس نے منہ بگاڑتے ہوئے نجو سے کہا۔

"جیجی! آخر کو اب حویلی کا انتظام اسی نے سنبھالنا ہے۔" اس نے گھور کر بیچ میں بولنے والی عورت کو دیکھا مگر اسے پہچان نہ پائی۔

"نجو ادھر آؤ' کیا باتیں بگھار رہی ہو۔ دیکھ نہیں رہی ہو' کھانا کھلایا جارہا ہے۔ آکر کھانا کھلاؤ۔" ماہین نے نجو کو دور سے جھاڑ پلائی' نور نے بھرپور حظ اٹھایا' اور ایک نظر اپنی دادی پر ڈالی جو سندھی کڑھائی کا بڑا سا سفید دوپٹہ اوڑھے انتہائی رغبت و اشتیاق سے عورتوں سے باتیں کررہی تھیں۔

"آفرین ہے' جیجی اماں کی اس عمر میں بھی کیا غضب کی یادداشت ہے۔" وہ ہنس کر مہ جبین کے ساتھ جھولے میں بیٹھتے ہوئے بولی۔" ہر عورت کا نام ذات شہر' فلاں کی بیٹی' فلاں کی بہو' اتے پتے سے واقف ہیں۔ واقعی مجھے تو بڑا مزہ آرہا ہے ان کی باتیں سن کے' تم کیوں اکتارہی ہو؟"

مہ جبیں نے حیرت سے استفسار کیا۔

"بھئی! میں تو بچپن سے ایسی باتیں سنتی اور دیکھتی آئی ہوں' یہ کوئی نئی بات ہے میرے لیے کیا؟"

"جیجی! آپ لوگوں کا کھانا دسترخوان پر چن دیا ہے' اندر کمرے میں۔" نوراں کی اطلاع پر نور نے اسے گھورا۔

"کیوں؟ ہم سے پوچھ کر لگایا ہے؟ بندے کا دل کھانے کو چاہے نہ چاہے بس خوامخواہ لو کھانا ہے۔"

"جیجی کنوار نے لگوایا ہے کھانا چھوٹی جیجی!" نوراں کہہ کر تیزی سے باورچی خانے میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

مسلسل ایک بے قراری اس کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

"اتنی بے چین کیوں ہوں میں آخر؟" وہ کئی بار جھنجلا کے اپنے آپ سے یہ سوال پوچھ چکی تھی۔

"جیجی! آپ کا ناشتہ۔" وہ اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے چونک پڑی' نجو ٹرے ٹیبل پر رکھ کر واپس جاچکی تھی۔

"السلام علیکم بابا سائیں!" عطار رسول اس کے سلام کا جواب دے کر اپنے مکتب کی طرف بڑھ گئے۔

وہ ناشتہ کرکے خود بھی ان کے پیچھے چلی آئی۔ وہ چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے۔ اس نے وقت گزاری کے لیے میز سے چند کاغذات اٹھائے۔

"حدیث ہے کہ جس کے دل میں ذرہ برابر غرور ہوگا' وہ جنت میں نہیں جائے گا۔"

اس نے دوسرا نوٹ پڑھا" دو خصلتیں مخلوق کی تباہی کا باعث بنتی ہیں' اول کسی بھی مخلوق کا احترام نہ کرنا' دوم خالق کے احسان کا ٹھکرادینا۔

حضرت بایزید بسطامی۔

دوسرے کاغذات پر بھی کچھ ایسی ہی تحریریں تھیں۔

"بابا سائیں اب شاید تکبر پر کوئی کتاب لکھ رہے ہیں۔" اس نے سوچتے ہوئے کاغذات واپس ٹیبل پر رکھے' مڑ کر پیچھے دیکھا' عطار رسول اب دعا مانگ رہے تھے۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"ہاں بیٹا! کچھ چاہیے کیا' پیسے ویسے؟" انہوں نے دعا کے بعد منہ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بابا۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔

"پتا نہیں کیوں بابا! صبح اٹھتی ہوں' تو بے چینی سی محسوس کرتی ہوں۔"

"فجر پڑھتی ہو؟" انہوں نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ سر جھکا کر لب کاٹنے لگی۔

انہوں نے ایک گہری سانس باہر خارج کی۔

"نہیں پڑھتیں نا؟"

"وہ بابا سائیں! آنکھ ہی نہیں کھلتی۔" وہ شرمندہ ہوگئی۔ آج سے کمپیوٹر پر فلمیں دیکھنا بند۔ جلد ہی سوجاؤں گی۔ اس نے دل ہی دل میں گویا اپنے آپ سے عہد کیا۔

"ہاں بابا! سیدوں کو لازمی نماز پڑھنا چاہیے۔"

"آں... ہاں... صرف سیدوں کو نہیں ہر مسلمان کو لازمی نماز پڑھنا چاہیے۔" انہوں نے بیٹی کی بات کاٹ کر انکار میں شہادت کی انگلی ہلائی۔

"بیٹا! یہ بات آپ کے ذہن میں کیوں بیٹھ گئی کہ سید افضل و بہتر ہیں۔ میں نے تو آپ سے کبھی ایسی بات نہیں کی۔"

"بابا سائیں! آپ نے تو کبھی کچھ نہ کہا۔ مگر لوگوں کی اتنی عزت و تکریم نے مجھے یہ باور کرایا کہ ہم کوئی خاص درجہ رکھتے ہیں۔"

"یہ تو امت کی آپ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے محبت تھی کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی آل سے محبت کرتے رہے۔ اور کرتے آرہے ہیں۔ دیکھو بیٹا! ہم اگر سادات ہیں تو اس میں ہماری کوئی کوشش' محنت کاوش نہیں ہے۔" انہوں نے بات ختم کرکے مسکرا کر نور کو دیکھا جو خود بھی مسکرارہی تھی۔

"شکریہ بابا سائیں! آپ نے میری الجھن ختم کردی۔" اس نے فرط مسرت سے باپ کے ہاتھ چوم لیے۔ پہلی بار وہ صفائی کرتی نوراں کو دیکھ کر آسودگی سے مسکرادی تھی۔

☼ ☼ ☼

"معراج! نور تمہیں کیسی لگتی ہے؟"

"بحیثیت کزن اچھی مگر کچھ متکبر اور خود پرستی میں مبتلا ہے۔"

میں کمرے میں جاتے جاتے رک گئی' میرا دل بڑے زور زور سے اچھلا تھا' ماہین بھابھی کے پوچھنے پر معراج کے جواب نے مجھے دم بخود کردیا تھا۔

میں نڈھال دل کو سنبھالے مہ جبیں کے کمرے میں چلی آئی' لڑکیاں کتنی بے وقوف ہیں' چند مسکراہٹوں اور جملوں سے آنکھوں میں خواب سجالیتی ہیں' ان خوابوں کو آنکھوں کی پتلیوں کے نیچے چھپا کر رکھتی ہیں۔

میں مغرور ہوگئی تھی' یا مجھے بنایا گیا تھا' یہ احساس مجھے پہلے کیوں نہ دلایا گیا' کیوں چشم پوشی اختیار کی گئی' جب میں لوگوں کو اپنے سے کم تر خیال کرتی تھی' کیوں ٹوکا نہ گیا جب میں نے پہلی بار نوراں کو کم ذات ملاح زادی کا طعنہ دیا۔

کتنے ہی دن میں سنجیدگی سے اپنی گزری زندگی کے بارے میں سوچتی رہی' خود احتسابی کے عمل سے گزرتی رہی' خود احتسابی بڑا کٹھن عمل ہے' مگر اب اس سے مفر ممکن نہیں تھی۔ خود کو ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا کیا تو کئی راز منکشف ہوئے اور میں خود اذیتی کے اس عمل سے گزرتی رہی' انا کی چیخ و پکار پر بالکل کان نہیں دھرا' میں نور العین عطار رسول شاہ سجادہ نشین کی اکلوتی نازو نعم میں پلی بیٹی اپنا دل چپ چاپ کہیں ہار گئی۔ اپنا آپ خود ہی گروی رکھ دیا' یہ زندگی کا پہلا دکھ تھا جو مجھے ملا۔

میرا تو پہلا دکھ پہلی کسک ہی محبت تھی۔

محبت جو بذات خود اضطراب' بے قراری اور درد کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور جب درد ملا تو درد کا احساس بھی ہوا۔

معراج وغیرہ اپنی آبائی حویلی میں منتقل ہوگئے تھے۔ یوں شادی تو گاؤں میں ہی ہوئی۔ مگر اس کے ایک ہفتے بعد میں بھائی اور بھابی کے ساتھ کراچی چند دن کے لیے آگئی اور وہیں دل کو روگ لگا بیٹھی' بار بار میری سماعتوں میں معراج کی آواز گونجتی۔

"میں بڑا سادہ سا بندہ ہوں۔ کسی متکبر لڑکی کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔" اس روگ کے بعد ادراک کے در وا ہوتے چلے گئے۔

جب آپ کو اپنی غلطیوں کوتاہیوں کا ادراک ہوجائے تو پھر آپ آہستہ آہستہ بدلنا شروع ہوجاتے ہیں۔

کچھ ہی عرصے بعد نوراں کے ساتھ میری علمی بحثیں ہونے لگیں' میں جو اسے کبھی منہ لگانا پسند نہیں کرتی تھی' اپنے آپ میں یہ بہت بڑی تبدیلی لے آئی تھی' عزت لینا کتنا آسان ہے' اور عزت دینا کم از کم میرے لیے مشکل ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

ملا... ماہ... ملاح... پانچ سالہ عبدالعلی کی آواز تیسری بار اس کے کانوں میں پڑی تھی' نظم پڑھتے ہوئے تیسری بار اس کا تسلسل ٹوٹا تھا' اس نے کتاب بند کرکے رائٹنگ ٹیبل پر رکھی۔ اور اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔

"ملا... ملاھ۔" وہ دوڑ کر نوراں کے تین سالہ بیٹے کے سر پر چپت لگاتا' واپس برآمدے میں آکر جھولے کو چند بار جھلاتا' پھر دوڑ کر صحن کے فرش پر بیٹھے اعظم کے ساتھ وہی عمل دہراتا' وہ پہلے تو کھیل سمجھ کر ہنستا رہا پھر بیزار ہوکر رونے لگا' اب کی بار جب عبدالعلی جھولے کو جھلایا تو پاس بیٹھی نور نے اس کی کلائیاں تھامیں۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے' اعظم کو ملاح کیوں کہہ رہے ہو؟" اس نے بھتیجے کو ڈانٹا۔

"ایسا نئیں کوں پھپو؟" (ایسا نہیں کہوں پھپھو۔)

"نہیں' اچھے بچے یوں نہیں کہتے۔"

"پھل (پھر) کیا کہنے (کہتے) ہیں؟"

"اس کا نام اعظم ہے نا! تو پھر اعظم کہو اسے۔" لہجے میں حیرت سے استفسار پر اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے سمجھایا۔ "اگر آئندہ ایسی بدتمیزی کی ناں تو بہت ماروں گی۔" اس نے دھمکایا۔

"ارے چھوٹی جیجی! آپ تو خوامخواہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر لے لیتی ہیں۔ اس میں ایسی کیا بات ہے' ملاح تو ہماری

ذات ہے۔" باورچی خانے سے نکلتی نوراں نے ہاتھ پونچھ کر روتے بسورتے بیٹے کو اٹھایا۔

"نہیں نوراں! ہمیں بچوں کو یہ سمجھانا ہے کہ جب بندے کا کوئی اختیار ہی نہیں تو ملا تو کڑھنا کیسا۔ سید ہونے پر فخر کیسا۔ ایک دوسرے کی عزت نفس کا خیال رکھنے کی تربیت ہمیں ابھی سے انہیں دینی چاہیے۔"

"بھئی مجھے تو ابھی سے فکر کھائے جارہی ہے کہ تم چلی جاؤ گی' تو ہمارے بچوں کو ایسی باتیں کون سمجھائے گا۔"

ساری روداد سنتی ہوئی ماہین بالآخر بولی۔

"کیوں میں کہاں جارہی ہوں؟" اس نے حیران ہو کر ماہین کو دیکھا۔

"ہاں تمہیں تو ہم بٹھائے رکھیں گے نا' بھئی آخر بیاہ بھی تو کرنا ہے تمہارا۔" وہ تھوڑی شوخ ہوئی۔ اس نے ماہین کو جواباً گھورا کر دیکھا۔ ماہین ہنس پڑی۔

"نوراں! اسے یہاں سلا دو۔" اس نے جھولے کی رلی کو درست کیا۔ "اندر میز پر کتاب رکھی ہوگی وہ دیتی جاؤ مجھے۔" اس نے ماں کی گود سے نکل کر بسورتے اعظم کو تھپکا۔ اندر میز سے کتاب اٹھاتی نوراں نے سوچا کہ نور بی بی کی کتابوں میں شاعری کی کتابیں زیادہ ہی ہونے لگی ہیں۔

محبت ریت جیسی ہے
کسی بھی بند مٹھی میں
مگر یہ بھی حقیقت ہے
اچانک بے خیالی میں
بنا سوچے بنا سمجھے
یونہی بس بے ارادہ ہی
یہ مٹھی کھل بھی جاتی ہے

اس نے نظم پڑھتے ہوئے آنکھیں بند کیں۔ ٹھنڈی خوشگوار ہوا کا جھونکا آیا تھا' اس نے مسرت سے آنکھیں کھولیں۔ اب بھیگی بھیگی ہوا کے جھونکے لگا تار آنے لگے۔

"لگتا ہے کہیں بارش ہوئی ہے۔" کتاب گود میں رکھتے ہوئے بولی۔

"مغرب میں کتنا وقت ہے؟" بی بی مریم نے چشمہ درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تو بہت ٹائم ہے اماں جیجی!" ماہین ان کے پاس جھولے میں آبیٹھی۔

"کیا کروں بوڑھی ہو گئی ہوں' پتہ ہی نہیں چلتا۔"

"اماں جیجی! اس میں آپ کا نہیں اس موسم کا قصور ہے۔" ماہین نے مسکرا کر نور کو دیکھا۔ وہ خاموشی سے مسکرادی۔

"تمہارا شاعری کا ذوق بڑھتا نہیں جارہا؟" ماہین نے کتاب اس کی گود سے اٹھائی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ماہین کو دیکھا۔

"یہ بھی کوئی جرم ہے؟"

"یہ بھی؟" ماہین کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ امڈ آئی۔ "کیا اس سے پہلے کوئی جرم سرزد ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟" اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔

"بھئی مطلب یہ کہ کوئی محبت کا......؟"

"ماہین!" صرف نام لے کر تنبیہہ کرنا اس کی کھلی ناراضی کا اظہار تھا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"بھابی ہوں تمہاری' صرف نام تو نہ لو۔"

نور نے کتاب چھین کر اس کے شانے پر ماری' مگر اس کی معنی خیز ہنسی رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

ہوا کے جھکڑ تیز ہو کر آندھی میں بدل گئے۔ دھول مٹی کا ایک طوفان اٹھا تھا۔ ماہین سرعت سے اٹھ کر بی بی مریم کو اندر کمرے میں لے جانے لگی' نور' اعظم کو اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی' نوراں جو بیٹے کی خبر لینے کے لیے باہر نکلی تھی' واپس باورچی خانے میں گھس گئی۔

یکدم چھما چھم بارش برسنے لگی' نور نے برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھولے' برآمدہ آدھے سے زیادہ بھیگ چکا تھا' تیز ہوا دور دور تک بوچھاڑ کی چادر پھیلاتی جارہی تھی۔ لڑکیوں کی محبت حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں' اس حماقت کے نتیجے میں رفاقت مل بھی جائے تو اس کے دامن میں چند دن محبت کے سکوں کے بعد وہی محبت حقارت کے کھوٹے داموں بک جاتی ہے۔

"جو لڑکی میرے ساتھ محبت کر سکتی ہے' وہ کسی اور کے ساتھ کیوں نہیں۔"

"عورت پر کبھی اعتبار مت کرو۔"

"نامحرم تو نامحرم ہے نا! میں نہیں کوئی اور سہی۔"

مختلف باتیں اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھیں' بہتے آنسو اس نے اپنی انگلیوں سے پونچھے تھے۔ کتنی ہی سرگوشیاں اس کی سماعتوں میں محبت کا نوحہ بن کر اتری تھیں' اس نے بے خیالی میں اپنی انگلیوں کے پوروں کو دیکھا' تب اسے لوٹنے میں وقت تو محسوس ہوئی مگر وہ لوٹ آئی' گو کہ دل کے ایک کونے میں اب بھی کوئی کسک زندہ تھی۔ مگر اس کسک پر شاید انسان کا اختیار نہیں ہوتا' سو وہ اپنے اختیار میں رہ کر دل کو اپنے ہی ہاتھوں قتل کر بیٹھی تھی۔

وہ اچانک ہونے والے شور سے اپنے خیالات کی نگری سے لوٹ آئی' مدھم ہوتی بارش میں معراج' ماں کو سہارا دے کر برآمدے میں لا رہا تھا۔

وہ کھڑکی سے ہٹ کر باہر آگئی' سلام کر کے معراج کی مسکراہٹ کو نظر انداز کیا' اور پھپھو سے لپٹ گئی۔ وہ حسب معمول اسے لپٹا کر بے تحاشا پیار کرنے لگیں۔

"بڑی اچانک آئی ہو؟" بی بی کنوار نے خوش دلی سے منہ کے گلے لگتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھابی! ماہین کو بتایا تھا رات فون پر۔ اس نے نہیں بتایا کیا؟"

"نہیں تو۔ شاید بھول گئی ہو۔" نور نے ماہین کو دیکھا۔ جو معراج کے ساتھ کھسر پھسر میں مصروف تھی۔

"جیجی پھپھو! بھیگ گئی ہیں آپ' پہلے چینج کر لیں' پھر جیجی اماں سے ملیے گا' ویسے بھی وہ اس وقت وظیفے میں مصروف ہوں گی۔" وہ نور کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

"لڑکی مغرور ہے۔" ماہین کی شوخ آواز ابھری۔

بہت ہی خوبصورت اور بہت مغرور ہوتی ہیں
رہا کرتی ہیں جو بھی لڑکیاں اونچے گھرانوں میں

"ہائے! کیا ہے کہ حسین لوگ ہوتے ہی مغرور ہیں۔" معراج کی برآمدے میں سے آتی آواز پر وہ ٹھٹکی۔

"سوچ لو زندگی بھر کا معاملہ ہے۔" ماہین ہنسی۔

"سوچ کر آیا ہوں۔ ہنسی خوشی گزار لوں گا۔" جواب بہت برجستہ آیا تھا۔

وہ ناسمجھی کے عالم میں مجسم حیرت بنی کھڑی تھی۔ واش روم سے نکلتی بی بی فردوس اسے یوں کھڑا دیکھ کر اس کی پیشانی چومی۔

"اچھا مستقبل کی ساس بہو میں پیار کے سین چل رہے ہیں' ای! یہ سین بعد میں بھی دیکھنے کو ملیں گے ناں؟" وہ اچھی خاصی کھسیانی ہو گئی۔ بی بی فردوس نے ہنس کر ماہین کے سر پر ایک چپت رسید کی اور باہر نکل گئیں۔

"بڑی چھپی رستم ہو' بھنک بھی ہوا بھی نہ لگنے دی۔"

"کس بات کی ہوا؟"

"خدا کی بندی کبھی تو کسی پر کھل جایا کرو۔" ماہین نے ہلکے سے مکا اس کے شانے پر مارا۔ اور مسکرا کر باہر چل دی۔

لڑکیوں کا بھرم ہر حالت میں قائم رہنا چاہیے۔ اس نے ماہین کی پشت کو دیکھ کر سوچا۔

بی بی مریم کے کمرے میں میٹنگ ہو رہی تھی۔ ماہین جلد از جلد کام نبٹا کر باقی ہدایات نور اں کو دیتی وہیں چلی آئی۔

"ادا! میں نے آپ کے آگے جھولی پھیلائی ہے' مجھے مایوس نہ کیجئے گا۔" عطار سول کتنی ہی دیر سے بہن کی منتیں سن رہے تھے' مگر وہ خاموش تھے۔

"مگر تم معراج کے ساتھ آئی ہو۔ کبھی دولہا بھی رشتہ مانگنے آیا ہے' نا تو غلام نبی تمہارے ساتھ آیا اور نہ ہی عبداللہ؟" بی بی مریم کے استفسار پر وہ ہنس پڑیں۔

"اماں! وہ آج تک اپنے کیے پر شرمندہ ہیں' کہنے لگے کیسے جائیں ہم اتنی بڑی مانگ مانگنے پہلے کون سا اچھا کیا ہے ہم نے ان کے ساتھ' ماجد کے امتحانات ہو رہے تھے' معراج کو پتا نہیں کہاں سے بھنک پڑ گئی کہ نور کے رشتے آئے ہیں' اماں! بھاگم بھاگ آئی ہوں' پیچھے وہ لوگ اتنے بے چین ہوں گے' بس آپ عندیہ دیں تو وہ لوگ فوراً آجائیں۔"

"ہیں' یہ رشتے کا کیسے پتا چلا معراج کو؟" بی بی مریم حیران ہوئیں۔

"اماں جیجی! معراج کا کچھ قرض ہے ہم سب پر۔ اسی نے تو دونوں خاندانوں کو ملایا تھا۔ اب اسے ناامید نہ کیجئے گا۔" ماہین نے انہیں زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

"بیٹا! اس کا باپ جو بھی فیصلہ کرے گا ہمیں منظور ہو گا۔"

"اماں جیجی! نور کی مرضی کے بغیر میں کوئی بھی فیصلہ نہیں کروں گا۔"

"تو بھلا لڑکیوں سے کب پوچھا جاتا ہے؟؟"

"اماں جیجی! پہلے نہیں پوچھا جاتا تھا تو اب پوچھا جائے گا۔" عطار سول مسکراتے ہوئے اٹھ گئے۔

نور نے سرمئی جلد والی ڈائری کھولی۔

میں نے تکبر کا سومنات توڑ دیا ہے۔

زیادتی علم کے تکبر کا بت۔

حسن و دولت کے تکبر کا بت۔

شرافت و نیابت کے تکبر کا بت۔

عبادت و ریاضت۔

عزت و اہمیت کے تکبر کے بت۔

میں بھی بت شکن بنی' کیونکہ میرے ہاتھوں بہت سے بت ریزہ ریزہ ہوئے ہیں۔ اس نے قلم روک کر سر اٹھایا۔

عطار سول شاہ دروازے پر کھڑے تھے۔ وہ احتراماً کھڑی ہو گئی۔

"بیٹا! تمہیں معراج کے رشتے پر کوئی اعتراض ہو تو بتا دو" اک بات واضح کردوں کہ تمہاری ہاں اور ناں ہر صورت میں مجھے منظور ہو گی۔" انہوں نے نور کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "بغیر کسی جھجک اور ہچکچاہٹ کے بتاؤ بیٹا!"

"بابا سائیں! آپ ..... آپ مختار ہیں۔" وہ حیا سے سرخ پڑ گئی۔

عطار سول شاہ اس کا ماتھا چوم کر' سب کو خوشخبری سنانے باہر چل دیے' اسے پتا تھا تھوڑی ہی دیر میں سب اس کے کمرے میں ہوں گے۔ مبارک باد کا شور اب اس تک پہنچ رہا تھا۔ جب تک ماہین دھاوا بولے تب تک یہ نظم پھر سے پڑھ لینی چاہیے' سرشاری سے مسکراتے ہوئے اس نے پھر سے کتاب کھولی۔

آج کے بعد میرے گھر میں
کبھی شام نہیں آئے گی۔
آج کے بعد ہوا کوئی پیغام نہیں لائے گی۔
نہ تمہاری یاد مجھے رات بھر رلائے گی۔
محبت میں حادثات کے بعد۔
بس اتنا جان لو۔
شکست دل کے کسی کونے سے۔
زندگی کی تمنا ابھر رہی ہے۔
اداسی آہستہ آہستہ سہی۔
بکھر رہی ہے۔